بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مدوّن

زمانہ وگر گونہ آئیں نہاد
شد آں مرغ، کو بیضہ زرّیں نہاد

یادش بخیر! وہ زمانہ بھی کیا زمانہ ہوگا، جب کہ ایشیائی علوم و فنون کے چشمے جزیرہ
ائے ہند کے گھر گھر میں اُبل رہے ہوں گے۔ تیمور سے پہلے اور اُس کے بعد جب
ب مسلمان فاتحین نے ہندوستان پر فاتحانہ حملے کیے ہیں اُس وقت کس کو یقین
و گا، کہ یہ آریاورت کا دیس ان بدیسیوں کی بدولت اپنی عالی شان و شوکت،
پنی کامل عظمت و جلالت، اپنی اتم لیاقت و علمیت کے لحاظ سے عہد خلفائے عباسیہ
ا ہم مہد ہو گا۔ یہی وہ مبارک زمانہ تھا۔ جب کہ فاتح قوم کے ساتھ تمام مفتوح اقوام

بھی قدم بقدم ترقی کے تمام میدانوں کو طے کرتی نظر آتی تھیں۔ جس حکمراں کو جن فنون و علوم کے کملا و ماہرین کی تلاش ہوتی تھی نگاہ التفات کے ایک معمولی سے اشارے پر ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں در دولت پر حاضر ہو جاتے تھے۔ قطب الدین ایبک سے مرحوم بہادر شاہ ظفر تک کے درباروں پر نظر ڈالی جائے، کوئی دربار ایسا نظر نہ آئے گا جس کے میر فروشوں میں منتخبین روزگار کے مجسمے لازمہ زینت و زیبائش نہ ہوں،

جس زمانے کی یہ حالت ہو اُس زمانے کی دلچسپیوں اور مشاغل کا کیا پوچھنا۔ سستا سماں۔ نئے فکری کا زمانہ۔ سلطنت قدردان، خود قابل، ان صورتوں میں جو مشغلے ہوں گے غالباً مفید اور علمی ہی ہوں گے۔ یہ مسلم ہے کہ کوئی مشغلہ بغیر تحریص و تقابل ترقی پزیر نہیں ہوتا۔ اور تحریص و تقابل کے لیے سوسائٹی کا ہم خیال و ہم لیاقت ہونا لازمی ہے۔ چناں چہ اُس زمانے میں ہم لیاقتی و ہم خیالی کی کمی نہ تھی جہاں کسی نے ایک خیال کو عملی جامہ پہنایا چراغ سے چراغ جلنے لگا۔

دیگر علوم و فنون کی طرح شاعری کا ستارہ بھی کچھ کم عروج پر نہ تھا۔ شاعروں کے مُنھ موتیوں سے بھرے جاتے تھے۔ سخن سنجوں کا کلام زر و جواہر میں تولا جاتا تھا۔ فرد فرد پر اشرفی صلے میں ملتی تھی۔ اور پھر جاگیرات و مناصب مستزاد۔ ان ترقیوں اور قدردانیوں کے نظارے ایک دو سال نہیں بلکہ چند در چند صدیوں تک دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتے رہے۔ مگر تیرھویں صدی ہجری کے آخر تک اُس

عروج نے سارے مدارج طے کرکے ترقی معکوس کی گردان شروع کردی۔ اور گویا چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی اُن باکمالوں کی مجلسوں اور مجمعوں کا پتہ نہ چلا جو بغیر سعی و کاوش ہر وقت اور ہر جگہ پیش نظر تھے۔ البتہ مجلسوں اور مجمعوں کی جگہ خال خال کوئی صاحب کمال نظر آجاتا تھا مگر آہ اور صد آہ کہ آج وہ حقیقی تحفۃ الرجال ہیں کہ بجز نام یاد رہ جانے کے اُن باکمالوں میں کسی ایک فرد کا نشان باقی نہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار ؎

پیش ازیں بر رفتگاں افسوس می خوردند خلق
می خورند افسوس در ایامِ ما بر ماندگاں

تیرھویں صدی کی آخری نمود اُس باکمال شاعر پر ختم ہوگئی جس کو علیٰ کُلِّ غالب کہنا ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ یعنی نجم الدولہ میرزا اسد اللہ خاں غالب جن کا پرانا دیوان نئے سامان کے ساتھ ان چند سطروں کے بعد پیش نظر ہوگا اُن باکمال اور فطرت شناس شعرا میں تھے جن کی سچی تعریف کے لیے فی زمانہ ہم جیسے نا اہلوں کو اس مشہور شعر کے پڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں:

سعدیا ثنائے تو نتواند بشرح گفت
خاموشی از ثنائے تو حدِّ ثنائے تست

مرزا غالب کی شاعری کے مدارج کو پہنچنا اور اُن کے اصلی مفہوم کو سمجھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اُردو شعرا میں وہی ایک اور صرف وہی ایک ایسے مختص النوع اور

مخترع الطبیعۃ فرد و فرید گزرے ہیں جن کی ہر بات میں جدّت ہر رنگ میں ندرت ہر تخئیل میں فوقیت نظر آتی ہے۔ اگرچہ اُن کی شاعری بھی بلحاظ اصول و قواعد کوئی نئی شاعری نہیں ہے۔ اصنافِ سخن کی وہی قسمیں اور اُن میں وہی پابندیاں نظر آتی ہیں جن کی ابتدا ولی نے اور ترمیم و اصلاح میر نے کی ہے۔ بااین ہمہ اُن کا کوئی قصیدہ کوئی مثنوی کوئی قطعہ کوئی غزل کوئی رباعی حتیٰ کہ ایک فردِ بھی ایسی نہ ملے گی جو اپنے علو تخئیل۔ رفعتِ مضمون موزوں اسالیب۔ تخصیص ترکیب اور دل آویز ادا میں تمام اساتذہ سلف و خلف کے کلام سے جداگانہ شان نہ رکھتی ہو۔ اُن کے ممتاز کلام کی ایک ادنیٰ سی شناخت یہ ہے کہ جب کوئی شعر اُن کا پڑھا جاتا ہے تو بغیر اس کے کہ نام و تخلص معلوم ہو سننے والا جس کا مذاق سخن صحیح ہے بلا تکلف سمجھ جاتا ہے کہ یہ مرزا غالب کا شعر ہے۔ یہی حیثیت ممیّزہ بتاتی ہے کہ اُن کے زمانے میں بعض اہل سخن بوجہ اجنبیّت روش معاصرانہ لاگ سے اُن کے کلام کو ناپسند کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اس معاندانہ خیال کا اثر اب تک یہ باقی ہے کہ جہاں ایسے لوگوں میں کوئی شعر فارسی اور اجنبی ترکیب و اضافت کا پڑھا یا سنا جاتا ہے تو نئے نکان کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ مرزا غالب کا رنگ ہے حالاں کہ یہ خیال واقعیّت سے کوسوں دور ہے۔

لاکھ مضمون اور اُس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلّف اور اُس کی سیدھی بات

انھیں خیالات سے متاثر ہوکر جابجا مرزا اسے مرحوم نے خود کہا ہے ؎

مشکل ہی زبس کلام میرا اے دل ✣ سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش ✣ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

فارسی ادب کی ایک مشہور مثل ہی "قدر مردم بعد مردم" جس کا مفہوم اس نتیجے سے ظاہر ہوتا ہی کہ آج نہ مرزا غالب زندہ ہیں نہ اُن کے معاصرین و قدر دان موجود ہیں علاوہ قابلیت و فن دانی باقی ہی مگر اس نئی اور مغربی دنیا کی روشنی میں ایک پرانے اور ایشیائی شاعر کے مویوں کی چمک غالب نظر آتی ہی ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اگر مرزا غالب شعرا کی طرح حلقۂ متصوفین میں بھی شامل ہوتے تو آج اُن کے قطعۂ ذیل کو ملفوظات کرامت میں شامل کیا جاتا۔ جو اپنے مرنے سے پیشتر فرما گئے ہیں ؎

تا ز دیوانم کہ مست سخن خواہد شدن ✣ ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است ✣ شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

یہی مقبولیت عام جو مرزا صاحب مرحوم کے انتقال سے چالیس پینتالیس سال بعد پیدا ہوئی ہی موجودہ اشاعت کی اصلی محرک ہی اور اسی تحریک نے نہ صرف مہتمم مطبع نظامی کو بلکہ اکثر احباب کو آمادہ کر دیا ہی کہ مرزا کے کلام کا صحیح اور دل کش ایڈیشن شائع کیا جاے۔

اب سے پہلے چند در چند ایڈیشن دیوان غالب کے چھپ چکے ہیں جن میں ۳ نسخے

ایسے ہیں جو مرزا کے مرحوم کی زندگی میں شائع ہوئے ہیں اور ایک آدھ کی تصحیح بھی مرزا سے منسوب کی گئی ہے۔ ان کے سوا چار پانچ نسخے متفرق مطبعوں سے نکلے ہیں۔ نیز دو تین شرّاح نے بدیل شرح دیوان کا بڑا حصّہ چھاپ دیا ہے مگر ان سب مطبوعہ نسخوں میں کوئی نسخہ ایسا نہیں دیکھا گیا جو کم از کم دس پانچ فاحش غلطیوں کا حامل نہو۔ ایسی صورت میں کہ خود مرزا کی زندگی میں دیوان شائع ہوا اور واقفین فن شرح کے ساتھ ان کا کلام چھاپیں پھر بھی ایک نہیں بیسیوں غلطیوں کا رہ جانا تعجب کی بات ہے۔

ہم نے اس دیوان میں جن باتوں کا التزام کیا ہے اُن کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے عمدہ کاغذ۔ دلفریب خط۔ موزوں تقطیع۔ صاف ستھری چھپائی کا خصوصیت سے انتظام کیا ہے۔ اور پھر آج کل کی رعایت کتابت سے تمام اُن نشانیوں کو باحتیاط تمام جابجا منضم کیا ہے جن کی بدولت معمولی اُردو خواں بھی بآسانی شعر کو صحیح پڑھ سکیں۔ پھر حتی الوسع صحت اشعار کا بھی خیال رکھا ہے اور مختلف دواوین اور شرحوں اور کلام مرزا کے حافظوں سے تصحیح و تصدیق و مقابلہ کیا ہے ان اہتماموں کے بعد بھی اگر کوئی فروگزاشت رہ گئی ہو تو اس کو بجز اقتضائے بشریت اور کیا کہا جا سکتا ہے ع

کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود۔

اس دیوان کی تحریک اشاعت اور ترتیب و تدوین کے متعلق خصوصیت کے ساتھ ہمیں دو معزز مہربانوں کا شکر گزار ہونا ہے۔ نمبر اول فخر قوم سید راس مسعود صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا (نبیرۂ سرسیّد مرحوم) جن کی متواتر تحریک اور اصرار خاص

نے ہمیں آمادہ کیا کہ دیوانِ غالب موجودہ حیثیت سے ملک میں شائع کریں۔ اس کے بعد اپنے مکرم دوست سید **معین الدین** صاحب شاہجہاں پوری مترجم اورنگ زیب و نپولین اعظم کے دل سے ممنون ہیں کہ انھوں نے اشارات املائی اور تصحیح و تدوین کے اہم کام کو نظامی پریس کی خاطر انجام دیا۔ پہلے اُنھوں نے مختلف چھاپے کے دیوانوں کو پیشِ نظر رکھکر نمونے کا ایک نسخہ اپنے قلم سے لکھا پھر اُس کو کاما۔ ڈیش علامت استفہام۔ اور دیگر علامات سے مزیب و مزین کیا۔ اُسی قلمی نسخے کی یہ نقل ہی جو آج آپ کے مبارک ہاتوں تک پہنچنے کا فخر حاصل کر رہی ہی ؎

برحمت قریں باد ایں دست و پنجہ
کہ از بہر ما کرد ایں دست رنجہ

اس دیوان میں ناظرینِ کرام کو کچھ کلام ایسا بھی ملے گا جو اب تک کے مطبوعہ دواوین میں نہیں ہی۔ اگرچہ اس کلام کے سوا ہم کو اور کلام بھی مرزا سے منسوب شدہ ملا مگر بعد تنقید و تحقیق جو کلام اُن کا متحقق ہوا وہی اس میں شامل کیا گیا۔ کیوں کہ یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مرزا غالب ہی کا نکھرا کلام یہ امتیازی فوقیت رکھتا ہی جو دوسروں کے کلام سے ممیز ہوسکتا ہی اور اسی معیار نے ہم کو کھوٹی ٹکسال سے کھرے سکوں کے الگ کرنے کا موقع دیا ورنہ ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

کسی شاعر کے کلام کے مطالعہ سے قبل اُس کے مختصر حالات سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے اس لیے چند احباب کا اصرار تھا کہ مرزا کی سوانح عمری بھی دیوان سے قبل دی جائے لیکن چوں کہ اس مضمون پر مولانا حالی مرحوم کی ایک بسوط تصنیف یادگار غالب شائع ہو کر ملک کے تمام علم دوست احباب کے ہاتوں تک پہنچ چکی ہے۔ لہذا اُسی کتاب سے مرزا کی لائف کے متعلق صرف مندرجہ ذیل اطلاعوں پر قناعت کی جاتی ہے۔

نام۔ مرزا اسد اللہ خاں المعروف بہ مرزا نوشہ۔

خطاب۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ۔

تخلص۔ غالب۔ ریختے میں ابتداءً اسد لکھتے تھے۔

خاندان۔ ایبک ترک۔ سلسلۂ نسب تورانی فریدوں سے ملتا ہے۔

ولادت۔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بمقام آگرہ۔

تعلیم۔ اول اول شیخ معظم ہندلی سے تعلیم پائی اُس کے بعد عبد الصمد نو مسلم ایرانی سے جن کا آتش پرستی کے زمانے میں ہرمز نام تھا فارسی زبان حاصل کی۔

تاہل۔ مرزا کی شادی ۱۲۲۵ھ میں نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں کے یہاں ہوئی تھی۔

مسکن۔ زمانہ طفولیت آگرے میں گزرا ۵۰ برس کے قریب دلّی میں رہے لیکن

کبھی کوئی ذاتی مکان نہیں خریدا کیا ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہتے رہے۔

اولاد۔ کوئی اولاد صلبی نہیں چھوڑی ابتدا میں سات بچے ہوئے مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔

شاعری مرزا کو فن سخن میں اپنے کمال پر بہت کچھ ناز تھا جو بالکل بجا تھا سلامتی طبع محققانہ نظر اُن کا حصّہ تھا اور باایں ہمہ وہ حق پسند بھی تھے۔ شاعری میں اُن کو باقاعدہ کسی سے تلمّذ حاصل نہ تھا لیکن وقت پسندی کو چھوڑ کر جب سے وہ سلاست کی طرف متوجّہ ہوئے تو کہنا پڑتا ہے کہ صفائی زبان میں اُنھوں نے میر تقی مرحوم کی تقلید کی۔ جن کے وہ بڑے معتقد تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
خود وہ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اور ؎

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

تصانیف۔ دیوانِ اُردو (کہا جاتا ہے کہ اس کو مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کی رائے سے مرزا نے اپنے بڑے دیوان سے منتخب کیا تھا اس زمانے میں اکثر غزلیں جو اس دیوان میں نہیں پائی جاتیں غالب کے غیر مطبوعہ کلام کے نام سے شائع ہو رہی ہیں۔ ہمارا جہاں تک خیال ہے یہ وہ ہی کلام ہے

جنہیں مرزا نے انتخاب میں نہیں لیا تھا) عودِ ہندی - اردوئے معلیٰ
کلیاتِ نثر و نظم فارسی - قاطعِ برہان - پنج آہنگ - مہرِ نیم روز -
(خاندان تیموریہ کی نامکمل تاریخ ہمایوں کے حالات تک) (...)
گلِ رعنا (انتخاب دیوان اردو و فارسی) لطائفِ غیبی ... وغیرہ متفرق
رسالے -

علمی مشاغل کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ ایک سرسری نظر میں تہ کو پہنچ جاتے تھے حقایق اور معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ میں رہتی تھیں -

بدیہہ گوئی اور ظرافت مرزا کی تقریر میں اُن کی تحریر اور اُن کی نظم نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا بقول مولانا حالی مزاج میں اس قدر ظرافت تھی کہ اگر اُن کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے - حسنِ بیان - حاضر جوابی - بات میں بات پیدا کرنا اُن کی خصوصیات میں سے تھا -

اخلاق - فراخ حوصلگی اور مروت نہایت وسیع الاخلاق کثیر الاحباب تھے جو شخص اُن سے ملنے جاتا کیسا ہی مغموم ہوتا خوش ہو کر آتا - فراخ حوصلہ ایسے کہ کوئی سائل اُن کے در سے خالی نہ پھرتا - غریبوں، محتاجوں کی حتی الامکان مدد کرتے -

خودداری بغیر پالکی یا ہوادار کے کبھی باہر نہ نکلے - عمائد شہر میں سے جو لوگ اُن کی ملاقات کو نہ آتے وہ بھی اُن کے مکان پر نہ جاتے - مرزا کی خودداری کی ایک مشہور مثال ہے کہ جب دہلی کالج کی پروفیسری کے لیے بلائے

گئے تو صرف اس بات پر بغیر ملے واپس چلے آئے کہ مسٹر ٹامسن جنھوں نے بلایا تھا اُن کے استقبال کو نہیں آئے۔

معاشی حالت

مرزا کو سات سو روپے سالانہ کی پنشن ملتی تھی غدر کے بعد تین سال تک یہ پنشن عارضی طور پر بند رہی تھی۔ اس زمانے میں مرزا کی نہایت عسرت سے بسر ہوئی۔ غدر کے دو سال بعد دربار رام پور سے سو روپیہ ماہوار ملنے لگے تھے جو وقت وفات تک جاری رہے۔ لیکن یہ تنخواہ بھی اُن کے خرچ کو کافی نہ ہوتی تھی۔ کبھی فراغت نصیب نہ ہوئی۔ ایک موقع پر فرمایا ہے۔ "میں کپڑے کھاتا ہوں"

مذہب

مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے توحید وجودی کے قائل تھے جس کا پتہ اُن کی شاعری سے ملتا ہے اُن کو اہل بیت رسالت سے نہایت محبت تھی اور غالباً تفضیلی تھے مولانا فخر قدس سرہ العزیز کے خاندان میں مرید بھی تھے اسی وجہ سے اُن کی تجہیز و تکفین اہل سنّت کے طریق پر عمل میں آئی۔

وفات اور مدفن

مرزا نے ۷۳ برس چار مہینے کی عمر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں انتقال کیا اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا

محبوب الٰہی میں دفن ہوئے۔

زاویہ نشین گمنامی
خاکسار
نظامی بدایونی
مہتمم نظامی پریس

بدایوں (روہیل کھنڈ)
۱۷ جنوری سنہ ۱۹۱۵ء

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی

BY THE COURTESY OF EDITOR "AL-ASR" LUCKNOW.

اُردو

دیوانِ غالب

(مطبوعہ نظامی پریس بدایوں)

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

نقش فریادی ہی کس کی شوخیِ تحریر کا؟
کاغذی ہی پیرہن - ہر پیکرِ تصویر کا !

کاوِ کاوِ سخت جانیہاے تنہائی - نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا - لانا ہی جوے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے - باہر ہی - دم شمشیر کا

آگہی - دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھاے
مدّعا عنقا ہی - اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں - غالب - اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موے آتش دیدہ - ہی - حلقہ مری زنجیر کا

جُز قیس - اور کوی نہ آیا بروے کار
صحرا - مگر - بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے دل اگر پڑا پایا
دل کہاں؟ کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دوستدار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری!
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم۔ لیکن اسقدر۔ یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا۔ تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے۔ زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے۔ کوئی پوچھے۔ تم نے کیا مزا پایا

دلِ مرا سوزِ نہاں سے۔ بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند۔ گویا۔ جل گیا

دل میں۔ ذوقِ وصل۔ و یادِ یار۔ تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی۔ کہ جو تھا جل گیا

مَیں عدم سے بھی پرے ہوں۔ ورنہ۔ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے۔ جوہرِ اندیشہ کی گرمی۔ کہاں
کچھ خیال آیا تھا۔ وحشت کا۔ کہ صحرا جل گیا

دل نہیں۔ تجھکو دکھاتا۔ ورنہ۔ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا۔ کروں کیا۔ کارفرما۔ جل گیا

مَیں ہوں اور افسردگی کی آرزو۔ غالب۔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

شوق۔ ہر رنگ۔ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیسِ تصویر کے پردے میں بھی۔ عُریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی۔ یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے۔ پَر افشاں نکلا

بوئے گل۔ نالۂ دل۔ دودِ چراغِ محفل
جو۔ تری بزم سے نکلا۔ سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ۔ تھا مائدۂ لذّتِ درد
کام یاروں کا۔ بقدرِ لب و دنداں نکلا

اے نو آموزِ فنا ہمّتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالب
آہ۔ جو قطرہ نہ نکلا تھا۔ وہ دریا نکلا!

دھمکی میں مر گیا۔ جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ۔ طلبگارِ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی۔ مرا رنگ زرد تھا

تالیفِ نسخہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال۔ ابھی۔ فرد فرد تھا

دل تا جگر۔ کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اِس رہگذر میں جلوۂ گُل۔ آگے۔ گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی؟
دل بھی اگر گیا۔ تو وہی دل کا درد تھا

احباب - چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال - بیاباں نورد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے - عجب آزاد مرد تھا

شمارِ سبحہ - مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کفِ بردنِ صد دل - پسند آیا

بہ فیضِ بے دلی - نومیدیِ جاوید - آساں ہے
کشایش کو - ہمارا عقدۂ مشکل - پسند آیا

ہوائے سیرِ گل - آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ - اندازِ بخوں غلتیدنِ بسمل - پسند آیا

جراحت تحفہ - الماس ارمغاں - داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ - غمخوارِ جانِ دردمند - آیا

دہر میں نقشِ وفا - وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ - کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے - ترا کاکلِ مشکیں نہ دبا
یہ زمرّد بھی - حریفِ دمِ افعی نہ ہوا!

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ جفائے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی۔ کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا۔ کہ مر جائیں۔ سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا

ستایش گر ہی زاہد۔ اسقدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہی ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے۔ بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا
کہ۔ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہی تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں نے جو تنکا۔ ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشہ۔ دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل۔ اک تخم ہے۔ سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشیدِ عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے۔ خونِ گرم۔ دہقاں کا

اُگا ہے۔ گھر میں ہر سُو سبزہ۔ ویرانی۔ تماشا کر
مدار اب گھاس کے ہے کھود دینے پر میرے درماں کا

خموشی میں۔ نہاں۔ خوں گشتہ۔ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں۔ میں بے زباں۔ گورِ غریباں کا

ہنوز۔ اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار۔ باقی ہے

دلِ افسردہ۔ گویا حُجرہ ہی یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کے۔ آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ

سبب کیا؟ خواب میں آکر تبسّم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم۔ کس کس کا لہو۔ پانی ہوا ہوگا

قیامت ہی۔ سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہی ہماری۔ جادۂ راہِ فنا غالبؔ

کہ یہ شیرازہ ہی۔ عالم کے اجزائے پریشاں کا

نہوگا۔ یک بیاباں۔ ماندگی سے۔ ذوق کم میرا

جابِ موجۂ رفتار ہی۔ نقشِ قدم میرا

محبّت تھی چمن سے۔ لیکن اب یہ بے دماغی ہی

کہ موجِ بوئے گل سے۔ ناک میں آتا ہی دم میرا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں۔ اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہی ساقی۔ خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تُو۔ دریاے مَی ہی۔ تو مَیں خمیازہ ہوں ساحل کا

محرم نہیں ہی تو ہی۔ نواہاے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہی۔ پردہ ہی ساز کا

رنگِ شکستہ۔ صبحِ بہارِ نظارہ ہی
یہ وقت ہی شگفتنِ گلہاے ناز کا

تُو۔ اور سوے غیر نظرہاے تیز تیز
مَیں۔ اور دُکھ۔ تری مژہ ہاے دراز کا

صرفہ ہی ضبطِ آہ میں میرا۔ وگرنہ مَیں
طعمہ ہوں۔ ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہی۔ سرِ شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہی تقاضہ۔ کہ ہی ہنوز
ناخن پہ قرض۔ اُس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا۔ اسد

سینہ - کہ تھا - دفینہ گہر ہاے راز کا

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب - یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی پھر - انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے - کہ گویا بتکدہ کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ - پر - کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں - ہاتھ میں نشتر کھلا

گو - نہ سمجھوں اسکی باتیں - گو - نہ پاؤں اسکا بھید
پر - یہ کیا کم ہے - کہ مجھسے - وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے - میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے - وہ عالم - کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا - اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں - مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے؟ شبِ غم ہے - بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہے گا؟ دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش؟ جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے - نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی امت میں ہوں میں - میرے رہیں کیوں کام بند؟

واسطے جس شہ کے۔ غالب۔ گنبدِ بے در کھلا

شب۔ کہ برقِ سوزِ دل سے۔ زہرۂ ابر۔ آب تھا
شعلۂ جوّالہ۔ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

واں۔ کرم کو۔ عذرِ بارش۔ تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے۔ یاں پنبۂ بالش۔ کفِ سیلاب تھا

واں۔ خود آرائی کو۔ تھا موتی پرونے کا خیال
یاں۔ ہجومِ اشک میں۔ تارِ نگہ۔ نایاب تھا

جلوۂ گل نے۔ کیا تھا۔ واں چراغاں۔ آب جُو
یاں۔ رواں مژگانِ چشمِ تر سے۔ خونِ ناب تھا

یاں۔ سرِ پُرشور۔ بیخوابی سے۔ تھا دیوار جُو
واں۔ وہ فرقِ ناز۔ محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں - نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں - بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش - واں - طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں - زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں - اس رنگ سے - خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل - کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذّت یاب تھا

نالۂ دل میں شب - اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزم - وصلِ غیر گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے - دل - کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق - مگر - سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایّامِ خاکستر نشینی - کیا کہوں

پہلوئے اندیشہ - وقفِ بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی - اپنے جنونِ نارسا نے - ورنہ - یاں
ذرّہ ذرّہ - رُوکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے ؟
کل تلک - تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن - کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں - اک دیدۂ بیخواب تھا
میں نے روکا رات غالب کو - وگرنہ - دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں - کفِ سیلاب تھا

اک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر - ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں - اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو - کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار - تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا - نہ پوچھ حال
ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ - آبدار - تھا

کم جانتے تھے - ہم بھی - غمِ عشق کو - پر اب
دیکھا تو - کم ہوئے پہ - غمِ روزگار تھا

بسکہ دشوار ہی - ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی مُیسّر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہی خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہی بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق - کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر - اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہی
جوہرِ آئینہ بھی - چاہے ہی مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنّا - مت پوچھ
عیدِ نظّارہ ہی شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تُو ہو - اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل - زخمِ تمنّا کھانا
لذّتِ ریشِ جگر - غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد۔ اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

شب۔ خمارِ شوقِ ساقی۔ رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت۔ خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم۔ وحشت سے۔ درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ۔ اجزائے دو عالم دشت کا۔ شیرازہ تھا

مانعِ۔ وحشت خرامیہائے لیلیٰ۔ کون ہے؟
خانۂ مجنونِ صحرا گرد۔ بے دروازہ تھا

پوچھ مت۔ رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
دست۔ مرہونِ حنا۔ رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دئے اوراقِ لختِ دل بباد
یادگارِ نالہ۔ ایک دیوانِ نے شیرازہ تھا

دوست۔ غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟
زخم کے بھرنے تلک۔ ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا؟

بے نیازی حد سے گذری۔ بندہ پرور۔ کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل۔ اور آپ فرمائیں گے۔ "کیا"

حضرتِ ناصح گر آئیں۔ دیدہ و دل۔ فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو۔ کہ سمجھائیں گے کیا؟

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں۔ وہ اب لائیں گے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہم کو قید۔ اچھا۔ یوں سہی

یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں - زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ بلا - زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟
ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا - کہ دلّی میں رہیں - کھائیں گے کیا؟

یہ نہ تھی ہماری قسمت - کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم - تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے؟ اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا - کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا - اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے - ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی؟ جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے؟ کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا - کوئی غم گسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو - کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو - یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے۔ پہ کہاں بچیں؟ کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا۔ غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں؟ کہ کیا ہے شبِ غم۔ بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا؟ اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا۔ ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا۔ نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا؟ کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی۔ تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیان غالب!
تجھے ہم ولی سمجھتے۔ جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار۔ کیا کیا
نہ ہو مرنا۔ تو جینے کا مزا کیا

تجاہل پیشگی۔ سے۔ مُدّعا کیا؟
کہاں تک۔ اے سراپا ناز۔ کیا کیا

نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا۔ گِلا کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

فروغِ شعلۂ حسن۔ یک نفَس ہے
ہوس کو۔ پاسِ ناموسِ وفا۔ کیا

نفس - موجِ محیطِ بیخودی ہی / تغافل ہاے ساقی کا گِلا - کیا

دماغِ عطرِ پیراہن - نہیں ہی / غمِ آوارگی ہاے صبا - کیا

دلِ ہر قطرہ ہی سازِ انا البحر / ہم اُس کے ہیں - ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہی؟ میں ضامن - اِدھر دیکھ / شہیدانِ نگہ کا - خوں بہا - کیا

سُن - اے غارتگرِ جنسِ وفا - سُن / شکستِ قیمتِ دل کی صدا - کیا

کیا کِس نے جگرداری کا دعوٰی؟ / شکیبِ خاطرِ عاشق - بھلا - کیا

یہ - قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟ / یہ - کافر فتنۂ طاقت رُبا - کیا

بلاے جاں ہی - غالب - اُس کی ہر بات
عبارت کیا - اشارت کیا - ادا کیا

درخُورِ قہر و غضب - جب - کوئی ہم سا نہوا
پھر غلط کیا ہی؟ کہ ہم سا کوئی پیدا نہوا

بندگی میں بھی۔ وہ آزادہ و خودبیں ہیں۔ کہ ہم
اُلٹے پھر آئے۔ درِ کعبہ۔ اگر۔ وا نہوا

سب کو مقبول ہی۔ دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو۔ کوئی بُتِ آئینہ سیما نہوا

کم نہیں۔ نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار۔ بُرا کیا ہی؟ گر اچھا نہوا

سینہ کا داغ۔ ہی وہ نالہ۔ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہی وہ قطرہ۔ جو۔ دریا نہوا

نام کا میرے ہی جو دُکھ۔ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہی۔ جو فتنہ۔ کہ برپا نہوا

ہر بُنِ مُو سے۔ دمِ ذکر۔ نہ ٹپکے خوں ناب؟

حمزہ کا قصّہ ہوا - عشق کا چرچا نہوا

قطرے میں - دجلہ دکھائی نہ دے؟ اور جزو میں کل؟
کھیل لڑکوں کا ہوا - دیدۂ بینا نہوا

تھی خبر گرم - کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے - پہ تماشا نہوا

پئے نذرِ کرم - تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلتیدۂ صد رنگ - دعویٰ پارسائی کا

نہو حسنِ تماشا دوست - رُسوا بیوفائی کا
بمہرِ صد نظر - ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

زکوٰۃِ حسن دے - اے جلوۂ بینش - کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو - کاسہ گدائی کا

نہ مارا جان کر بے جرم- غافل- تیری گردن پہ
رہا- مانندِ خونِ بے گنہ- حق آشنائی کا

تمنائے زباں- محوِ سپاسِ بے زبانی ہی
مٹا جس سے تقاضہ- شکوۂ بیدست وپائی کا

ہی اک بات ہی- جو- یاں نفس- واں نکہتِ گل ہی
چمن کا جلوہ باعث ہی مری رنگیں نوائی کا

ہانِ ہر بُتِ پیغارہ جُو- زنجیرِ رسوائی
عدم تک- بے وفا- چرچا ہی- تیری بیوفائی کا

دے نامے کو اِتنا طول- غالب مختصر لکھدے
کہ حسرت سنج ہوں- عرضِ ستم ہائے جدائی کا

ر نہ اندوہِ شبِ فرقت- بیاں ہو جائے گا	بے تکلف داغِ مہ- مہرِ دہاں ہو جائے گا

زہرہ - گر ایسا ہی - شامِ ہجر میں ہوتا ہی آب
پرتوِ مہتاب - سیلِ خانماں ہوجائے گا

لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاوں کا بوسہ - مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر - بدگماں ہوجائے گا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے - کیا معلوم تھا
یعنی - یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہوجائے گا

سب کے دل میں ہی جگہ تیری - جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا - اک زمانہ مہرباں ہوجائے گا

گر - نگاہِ گرم فرماتی رہی - تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں - جیسے خوں رگ میں نہاں ہوجائے گا

باغ میں مجھ کو نہ لیجا - ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر - ایک چشمِ خونفشاں ہوجائے گا

وائے - گر میرا ترا انصاف محشر میں نہو
اب تلک تو یہ توقع ہی - کہ - واں ہوجائے گا

فائدہ کیا - سوچ - آخر تو بھی دانا ہی اسد
دوستی ناداں کی ہی - جی کا زیاں ہوجائے گا

اسد - ہم وہ جنوں جولاں - گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہی سر پنجۂ مژگانِ آہو - پشت خار - اپنا

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا - برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب - کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں - مرا بھلا نہ ہوا

جان دی - دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یوں ہے - کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا - لہو نہ تھما
کام گر رُک گیا - روا - نہ ہوا

رہزنی ہے - کہ دلستانی ہے!
لیکے دل - دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے - کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب - غزل سرا نہ ہوا

گلہ ہی شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
گھر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں۔ کہ تو۔ اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں۔ ذوقِ خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہی۔ بہار اگر ہی یہی
دوام کلفتِ خاطر ہی عیش دنیا کا

غمِ فراق میں۔ تکلیفِ سیر باغ۔ ندو
مجھے دماغ نہیں۔ خندہ ہائے بیجا۔ کا

ہنوز۔ محرمیِ عشق کو ترستا ہوں
کرے ہی ہر بُنِ مو۔ کام چشمِ بینا کا

دل اُس کو۔ پہلے ہی ناز و ادا سے۔ دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حُسن سے تقاضا کا

نہ کھ۔ کہ۔ گریہ۔ بمقدارِ حسرتِ دل ہی
مری نگاہ میں ہی جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے۔ کرتا ہوں اُسکو یاد۔ اسد
جفا میں اُسکی ہی۔ انداز کار فرما۔ کا

قطرۂ مے۔ بسکہ حیرت سے۔ نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے۔ سراسر رشتۂ گوہر ہو

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ۔ لیکن۔ وہ خفا مجھ

جب۔ بہ ترتیبِ سفر۔ یار نے محمل باندھا
تپشِ دل نے۔ ہر اک ذرّہ پہ۔ اک دل باندھا
اہلِ بینش نے۔ بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئنہ کو
یاس و امید نے۔ یک

وہ دن گئے - کہ اپنا دِل سے جگر جدا تھا

ماندگی میں غالب - کچھ بن پڑے - تو جانوں

جب رِشتہ نے گرہ تھا - ناخن گرہ کُشا تھا

تا | بحر - گر بحر نہ ہوتا - تو - بیاباں ہوتا

نہ ہوتا - تو - پریشاں ہوتا

ارکا - دربان ہوتا

وہ ہر ایک بات پر کہنا - کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

یک ذرۂ زمیں - نہیں بیکار - باغ کا
یاں جادہ بھی - فتیلہ ہی - لالہ کے داغ کا

نے مے - کسے ہی - طاقتِ - آشوبِ آگہی
کھینچا ہی - عجزِ حوصلہ نے - خط ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں - خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جسکو عشق - خلل ہی - دماغ کا

تازہ نہیں ہی - نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں - دودِ چراغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں - کہ دل ہی عدو ہی فراغ کا

ن دل ہی چشم میں - موجِ نگہ - غبار
یہ میکدہ - خراب ہی - مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا - بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار - خم کدہ - کس کے دماغ کا ؟

سے چینِ جبیں سے - غمِ پنہاں - سمجھا
رازِ مکتوب بہ - بے ربطیِ عنواں سمجھا

لف بیش نہیں - صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں - جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر - مت پوچھ
اِسقدر تنگ ہوا دل - کہ میں زنداں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
رُخ پہ ہر قطرہ عرق - دیدۂ حیراں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

سنگِ عشق میں - کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل - تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا - اسقدر آساں سمجھا!

دل دیا - جان کے - کیوں اُسکو - وفادار - اسد
غلطی کی - کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا - یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

عذر واماندگی - اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا - جگر یاد آیا اپنا

زندگی - یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

کیا ہی ضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ - وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہی خیال
دلِ گم گشتہ - مگر - یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہی!
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اُٹھایا تھا - کہ سر یاد آیا

کوئی تاخیر - تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے - مگر - کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بیجا ہی - مجھے اپنی تباہی کا گِلہ
اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو۔ تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا؟

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں۔ کچھ اک رنج گرانبارئ زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے۔ کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اس کو کہوں۔ اور کچھ نہ کہے! خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے۔ تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو۔ ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا؟
نالہ کرتا تھا۔ و لے طالب تاثیر بھی تھا

پیشہ میں عیب نہیں۔ رکھیئے نہ فرہاد کو نام

ہم ہی آشفتہ سروں میں - وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے - پاس نہ آیا نہ سہی
آخر - اُس شوخ کے ترکش میں - کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا - دمِ تحریر - بھی تھا؟

ریختی کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں - اگلے زمانہ میں کوئی میر - بھی تھا

لبِ خشک - در تشنگی مردگاں - کا ہمہ نا امیدی - ہمہ بدگمانی	زیارت کدہ ہوں - دل آزردگاں - کا میں دل ہوں - فریبِ وفا خوردگاں - کا
دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے	اوروں پہ ہے وہ ظلم - کہ مجھ پر نہ ہوا تھا خورشید - ہنوز اُسکے برابر نہ ہوا تھا

توفیق - باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ - کہ گوہر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

میں سادہ دل - آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی - سبقِ شوقِ مکرّر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی - تُنک آبی سے ہوا خشک
میرا - سرِ دامن بھی - ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسد - داغِ جگر سے مرے تحصیل
آتش کدہ - جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

شب - کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع - خارِ کسوتِ فانوس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کسقدر - یارب - ہلاکِ حسرتِ [illegible]

حاصلِ الفت نہ دیکھا - جز شکستِ آرزو
دل - بہ دل پیوستہ - گویا ایک [illegible]

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل - بے منّتِ کیموس تھا

آئینہ دیکھ - اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو - دل نہ دینے پہ کتنا غرور

قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے	اُسکی خطا نہیں ہی۔ یہ میرا قصور تھا
عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا	جس دل پہ ناز تھا مجھے۔ وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوے	ہوں شمعِ کشتہ۔ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل۔ اور ہی تدبیر کر۔ کہ میں	شایانِ دستِ بازوے قاتل نہیں رہا
بر روے شش جہت۔ درِ آئینہ باز ہی	یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن	غیر از نگاہ۔ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا۔ رہینِ ستمہاے روزگار	لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
[illegible] سے ہواے کشتِ وفا مٹ گئی۔ کہ واں	حاصل۔ سواے حسرتِ حاصل۔ نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا۔ مگر۔ اسد
جس دل پہ ناز تھا۔ مجھے۔ وہ دل نہیں رہا

[illegible]نک کہتا ہی۔ کہ اُس کا غیر سے اخلاص۔ حیف!

عقل کہتی ہی۔ کہ وہ بے مہر کس کا۔ آشنا
ذرّہ ذرّہ۔ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہی
گردشِ مجنوں۔ بہ چشمکہاے۔ لیلا آشنا
شوق ہی۔ ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ۔ صحرا دستگاہ۔ و۔ قطرہ۔ دریا آشنا
ہیں۔ اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی۔ کہ ہی
عافیت کا دشمن۔ اور۔ آوارگی کا۔ آشنا
شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر۔ نہ رہنا چاہیے
میرا۔ زانو مونس۔ اور۔ آئینہ تیرا۔ آش
کوہکن۔ نقّاشِ یک تمثالِ شیریں تھا۔ اسد
سنگ سے سر مار کر۔ ہووے نہ پیدا۔ آش

ذکر اُس پری وش کا۔ اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب۔ آخر۔ تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے۔ بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر۔ ہم اور بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا۔ کاشکے مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے۔ آشنا نکلا اُن کا پاسباں۔ اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں۔ اُنکو دکھلا دوں
اُنگلیاں فگار اپنی۔ خامہ خوں چکاں اپنا

گھستے گھستے مِٹ جاتا۔ آپ نے عبث بدلا

ننگِ سجدہ سے میرے۔ سنگ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمّازی۔ کرلیا ہے۔ دشمن کو

دوست کی شکایت میں۔ ہم نے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے۔ کس ہنر میں یکتا تھے

بے سبب۔ ہوا۔ غالب۔ دشمن آسماں اپنا

سرمہ مفت نظر۔ ہوں۔ مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

رخصتِ نالہ مجھے دے۔ کہ مبادا۔ ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر۔ غمِ پنہاں میرا

غافل۔ بہ وہمِ ناز۔ خود آرا ہے۔ ورنہ یاں

بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

بزمِ قدح سے عیش تمنا نہ رکھ۔ کہ رنگ

صیدِ زدام جستہ ہے۔ اس دام گاہ کا

رحمت اگر قبول کرے - کیا بعید ہی ؟
شرمندگی سے - عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو - کس نشاط سے جاتا ہوں میں - کہ ہی
پُرگل - خیالِ زخم سے - دامن نگاہ کا

جاں - درہوائے یکنفسِ گرم ہی - اسد
پروانہ ہی وکیل - ترے دادخواہ کا

جور سے باز آئے پر - باز آئیں - کیا
کہتے ہیں - "ہم تجھکو مُنہ دکھلائیں کیا"

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہورہے گا کچھ نہ کچھ - گھبرائیں کیا

لاگ ہو - تواُسکو ہم سمجھیں - لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی - تو دھوکا کھائیں کیا

ہولیئے کیوں - نامہ بر کے ساتھ ساتھ ؟
یارب - اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا ؟

موجِ خوں - سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے - اُٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر - دیکھئے - دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ - کہ "غالب کون ہے"؟
کوئی بتلاؤ - کہ - ہم بتلائیں کیا

لطافت - بے کثافت - جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے - آئینۂ بادِ بہاری کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں - خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو - تو - باطل ہے - دعویٰ ہوشیاری کا

عشرتِ قطرہ ہے - دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا - ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا - بات کے بنتے ہی - جدا ہو جانا

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا - گھسنے میں - اس عقدہ کا - ہا آساں ہونا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم - اللہ اللہ
اس قدر - دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا تھا

ضعف سے - گریہ - مبدّل بہ دمِ سرد - ہوا	باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال	ہو گیا - گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا - برس کر کھلنا	روتے روتے غمِ فرقت میں - فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس ؟	کیوں ہے ؟ گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تا کہ - تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل	دیکھ - برسات میں - سبز آئنے کا - ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل - ذوقِ تماشا - غالب

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ردیف (ب)

...ہی ہنگامہ

...در

...ں اُڑتی - کہ ہو بال کُشا - موجِ شراب

دے بطِ مے کو - دلِ دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت۔ وجہِ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہی ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے۔ بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گذرے پہ بھی۔ ہی بالِ ہما موجِ شراب

ہی یہ برسات وہ موسم۔ کہ عجب کیا ہے۔ اگر
موجِ ہستی کو۔ کرے فیضِ ہوا۔ موجِ شراب

چار موج اُٹھتی ہی۔ طوفانِ طرب سے ہر سُو
موجِ گل۔ موجِ شفق۔ موجِ صبا۔ موجِ شراب

جسقدر روح بناتی ہی۔ جگر تشنۂ ناز
دے ہی تسکیں۔ بدمِ آب بقا۔ موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہی۔ رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر

شہپرِ رنگ سے۔ ہی بال کشا موجِ شراب
موجۂ گل سے۔ چراغاں ہی گذرگاہِ خیال

ہی تصور میں زبس۔ جلوہ نما موجِ شراب
نشہ کے پردے میں ہی محوِ تماشاے دماغ

بسکہ رکھتی ہی سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل

موجۂ سبزۂ نوخیز سے۔ تا موجِ شراب
[illegible] ہنگامۂ ہستی ہی۔ زہے موسمِ گل

رہبرِ قطرہ بہ دریا ہی۔ خوشا موجِ شراب
[illegible]ں اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ۔ اسد

پھر ہوا وقت۔ کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ردیف (ت)

افسوس۔ کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کے تھے درخورِ عقدِ گہر انگشت

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

جگر کو مرے عشقِ خوں نابہ مشرب
لکھے ہے! خداوندِ نعمت سلامت

علی الرّغم دشمن شہید وفا ہوں
مبارک مبارک سلامت سلامت

نہیں گر سرو برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ

یار لائے مرے بالیں پہ اُسے۔ پر کس وقت!

آمدِ خط سے ہوا ہی سرد۔ جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کُشتہ تھا۔ شاید خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش۔ ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہی تابِ جلوۂ دیدارِ دوست ؟

خانہ ویراں سازیِ حیرت۔ تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں۔ رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں۔ بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر۔ گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن۔ کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہی
دیدۂ پُرخوں ہمارا۔ ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہی پرسش مجھ سے اُسکے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست!

تاکہ میں جانوں۔ کہ ہی اُس کی رسائی واں تلک
مجھکو دیتا ہی پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سرکرے ہی وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھکو روتے دیکھ پاتا ہی اگر
ہنس کے کرتا ہی بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے؟
یا بیاں کیجے۔ سپاسِ لذّتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہی آپ

ہی ردیف شعر میں - غالب - زبس تکرارِ دوست

ردیف ج

گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہی آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہی آج

آتا ہی ایک پارۂ دل - ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس - کمندِ شکارِ اثر - ہی آج

اے عافیت کنارہ کر - ای انتظام چل
سیلابِ گریہ - درپئے دیوار و در ہی آج

لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو - تو مسیحا کا - کیا علاج!

ردیف چ

نفسِ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں - انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید - نہ پوچھ
برنگِ خار - مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار - اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہے بحسرت - نظارۂ نرگس
بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ - ادا کر - حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے - خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ - کبابِ دلِ سمندر کھینچ

ردیف د

حسن - غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے - آرام سے ہیں - اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے - تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہی دلِ خاک میں۔ احوالِ بُتاں پر۔ یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا۔ میرے بعد
در خورِ عرض نہیں۔ جوہرِ بیداد کو۔ جا
نگہِ ناز۔ ہی سُرمہ سے خفا۔ میرے بعد
ہی جنوں۔ اہلِ جنوں کے لیے۔ آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہی گریباں سے جدا میرے بعد
کون ہوتا ہی حریفِ مَے مرد افگنِ عشق ؟
ہی مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں۔ کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ فنا میرے بعد؟

ردیف ر

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر۔ در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں۔ بال و پر۔ در و دیوار

وفورِ اشک نے۔ کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در۔ در و دیوار

نہیں ہے سایہ۔ کہ۔ سنکر نویدِ مقدمِ یار۔
گئے ہیں چند قدم پیشتر۔ در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ!
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار۔ تو۔ آ
کہ ہیں۔ دکانِ متاعِ نظر۔ در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے۔ نہ مرے پاؤں پر۔ در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں۔ تو سلئے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر۔ در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہی بن تیرے گھر کی آبادی	ہمیشہ روتے ہیں ہم - دیکھ کر - در و دیوار
نہ پوچھ - بیخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب	کہ ناچتے ہیں پڑے - سر بسر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے - کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت - مگر - در و دیوار

گھر جب بنا لیا ترے در پر - کہے بغیر	جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر؟ کہے بغیر
کہتے ہیں - جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن	"جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر؟"
کام اس سے آ پڑا ہی - کہ جس کا جہان میں	لیوے نہ کوئی نام - ستمگر کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہی ہمارے - وگرنہ - ہم	سر جائے یا رہے - نہ رہیں پر - کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا	چھوڑے نہ خلق - گو - مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہی ناز و غمزہ - ولے - گفتگو میں - کام	چلتا نہیں ہی دشنہ و خنجر - کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو	بنتی نہیں ہی - بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں۔ تو چاہیے۔ دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات۔ مکرّر کہے بغیر

غالب۔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھکر؟
جلتا ہوں۔ اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر

آتشِ پرست کہتے ہیں۔ اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہائے شرر بار دیکھکر

کیا آبروے عشق؟ جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں۔ تم کو بے سبب آزار دیکھکر

آتا ہے میرے قتل کو۔ پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اُسکے ہاتھ میں تلوار دیکھکر

ثابت ہوا ہے۔ گردنِ مینا پہ۔ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھکر

واحسرتا۔ کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھکر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن۔ عیارِ طبعِ خریدار دیکھکر

زنّار باندھ۔ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

ان آبلوں سے پانوں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھکر

کیا بدگماں ہے مجھ سے۔ کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی۔ نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ۔ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے۔ تری دیوار دیکھکر

لرزتا ہے مرا دل۔ زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فنا تعلیم درسِ بیخودی۔ ہوں۔ اُس زمانے سے
کہ۔ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فراغت کسقدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے!
بہم گر صلح کرتے پارہائے دل۔ نمکداں پر

نہیں اقلیمِ الفت میں۔ کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پشتِ چشم سے جسکی نہووے مُہر عنواں پر

مجھے اب۔ دیکھکر ابرِ شفق آلودہ۔ یاد آیا
کہ فرقت میں تری۔ آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز۔ کیا باقی رہا ہوگا؟
قیامت اک ہوائے تُند ہی۔ خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے۔ غالب۔ کیا ہوا۔ گر اُس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہی۔ گریباں پر

ہی بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور

کرتے ہیں محبت - تو گذرتا ہی گماں اور

یارب - وہ نہ سمجھے ہیں - نہ سمجھیں گے مری بات

دے اور دل اُن کو - جو نہ دے مجھکو زباں اور

ابرو سے ہی کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند

ہی تیر مقرر - مگر اُس کی ہی کماں اور

تم شہر میں ہو - تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھیں گے

لے آئیں گے بازار سے - جاکر - دل و جاں اور

ہر چند سُبک دست ہوئے - بُت شکنی میں

ہم ہیں - تو ابھی راہ میں ہی - سنگِ گراں اور

ہی خونِ جگر جوش میں - دل کھول کے روتا

ہوتے جو کئی - دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں۔ اس آوازپہ۔ ہر چند۔ سر اُڑ جائے
جلّاد کو۔ لیکن وہ کہے جائیں کہ۔ "ہاں اور"

لوگوں کو ہی خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں۔ اک داغِ نہاں اور

لیتا۔ نہ اگر دل تمھیں دیتا۔ کوئی دم چین
کرتا۔ جو نہ مرتا۔ کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ۔ تو رُک جاتے ہیں نالے
رُکتی ہی مری طبع۔ تو ہوتی ہی رواں۔ اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں۔ کہ "غالب کا ہی اندازِ بیاں اور"

صفائے حیرتِ آئینہ۔ ہی سامانِ زنگ آخر

تغیّر۔ آبِ برجا ماندہ۔ کا پاتا ہی رنگ۔ آخر

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی

ہوا۔ جامِ زمرّد بھی۔ مجھے داغِ پلنگ آخر

جنوں کی دست گیری کس سے ہو؟ گر ہو نہ عُریانی

گریباں چاک کا حق ہو گیا ہی میری گردن پر

برنگِ کاغذِ آتش زدہ۔ نیرنگِ بے تابی

ہزار آئینہ دل باندھے ہی۔ بالِ یک تپیدن پر

فلک سے ہمکو عیشِ رفتہ کا۔ کیا کیا تقاضا ہی

متاعِ بُردہ۔ کو سمجھے ہوے ہیں۔ قرض۔ رہزن پر

ہم۔ اور۔ وہ بے سبب رنج آشنا دشمن۔ کہ رکھتا ہی

شُعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فنا کو سونپ کر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک۔ ہے موقوف گلخن پر

اسدؔ۔ بسمل ہے کس انداز کا! قاتل سے کہتا ہے
"تو مشقِ ناز کر۔ خونِ دو عالم میری گردن پر"

ستم کش مصلحت سے ہوں۔ کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلّف برطرف۔ مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

لازم تھا۔ کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر۔ گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل۔ اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"

مانا۔ کہ ہمیشہ نہیں۔ اچھا۔ کوئی دِن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو۔ "قیامت کو ملیں گے"

کیا خوب! قیامت کا ہی گویا کوئی دِن اور؟

ہاں۔ اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی۔ عارف

کیا تیرا بگڑتا؟ جو نہ مرتا کوئی دِن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے

پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دِن اور؟

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد ستد کے

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دِن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی۔ نیّر سے لڑائی

بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری - نہ بہر حال - یہ مدّت خوش و ناخوش ؟
کرنا تھا جواں مرگ گذارا کوئی دِن اور

ناداں ہو - جو کہتے ہو - کہ - "کیوں جیتے ہیں غالبؔ"
قسمت میں ہی مرنے کی تمنّا کوئی دِن اور

ردیف "ز"

فارغ مجھے نہ جان - کہ مانندِ صبح و مہر
ہی داغِ عشق - زینتِ جیب و کفن ہنوز

ہی نازِ مفلساں - زرِ ازدست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

مے خانۂ جگر میں - یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہی بُتِ بیداد فن ہنوز

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں - فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب - کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہرزہ - بیاباں نوردِ وہم وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہی نشیب و فراز

وصال۔ جلوہ تماشا ہی۔ پر دماغ کہاں
کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

ہر ایک ذرّہ عاشق ہی۔ آفتاب پرست
گئی نہ۔ خاک ہوئے پر۔ ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالب
جہاں۔ یہ کاسۂ گردوں ہی۔ ایک خاک انداز

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ۔ کہ سرتا سرِ خاک
گذرے ہی۔ آبلہ پا ابرِ گہر بار۔ ہنوز

یک قلم۔ کاغذ آتش زدہ ہی صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہی تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

کیونکر۔ اس بت سے رکھوں جان عزیز؟
کیا نہیں ہی مجھے ایمان عزیز؟

دِل سے۔ نکلا پہ نہ نکلا۔ دِل سے
ہی ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لاتے ہی بنے گی۔ غالب
واقعہ سخت ہی۔ اور جان عزیز

نہ گلِ نغمہ ہوں۔ نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تُو۔ اور آرایشِ خمِ کاکل
میں! اور اندیشہائے دور و دراز؟

لافِ تمکیں۔ فریبِ سادہ دِلی
ہم ہیں۔ اور رازہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہی طاقتِ پرواز

وہ بھی دِن ہو۔ کہ اُس ستمگر سے
ناز کھینچوں۔ بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا جلوہ۔ پک قلم انگیز
اے ترا ظلم۔ سر۔ بسر اندازِ

تو ہوا جلوہ گر۔ مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھکو پوچھا۔ تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب۔ اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں۔ تمام ہوا
اے دریغا۔ وہ رندِ شاہد باز

ردیف س

مژدہ - اے ذوقِ اسیری - کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی - قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار - تسلّی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی - بنِ ہر خار کے پاس

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے -
خوب وقت آئے تم - اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا - جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھئے - لیکن اے دل
نہ کھڑے ہوجئے خوباں دلِ آزار کے پاس

دیکھکر تجھکو چمن - بسکہ نمو کرتا ہے

خود بخود۔ پہنچے ہی۔ گل گوشۂ دستار کے پاس
مر گیا پھوڑ کے سر۔ غالبِ وحشی ہی ہی۔
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

ردیف "ش"

نہ لیوے گر۔ خسِ جوہر۔ طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں۔ روئے نگار۔ آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہی حلّ مشکلِ عاشق
نہ نکلے۔ شمع کے پاسے۔ نکالے گر نہ خار۔ آتش

ردیف "ع"

رخِ نگار سے ہی سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہی آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع

زبانِ اہلِ زباں میں ہی مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

کرے ہی صرف بہ ایماے شعلہ قصہ تمام
بطرزِ اہلِ فنا ہی فسانہ خوانیِ شمع

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہی اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہی ناتوانیِ شمع

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہی
بجلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہی شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

جلے ہی دیکھ کے بالینِ یار پر مجھکو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہی تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہی ماہِ نو سے آغوشِ وداع

ردیف "ف"

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

جلتا ہی دل - کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے | اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

ردیف "ک"

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک | کیا مزہ ہوتا - اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ ناز زخمِ دل | ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کستقدر پیدا نمک

مجھکو ارزانی رہے تجھکو مبارک ہو جیو | نالۂ بلبل کا درد - اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا؟ کہ آج | گردِ ساحل ہی - بزخمِ موجۂ دریا - نمک

داد دیتا ہی مرے زخمِ جگر کی - واہ واہ | یاد کرتا ہی مجھے - دیکھے ہی وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہی | دل طلب کرتا ہی زخم - اور مانگیں ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا - پئے توفیرِ درد | زخم مثلِ خندۂ قاتل ہی - سرتاپا نمک

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن؟ کہ فرطِ ذوق میں

زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب۔ اور تمنّا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ردیف "گ"

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت - دُعا نہ مانگ
یعنی - بغیر یک دلِ بے مدعا - نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار - یاد
مجھ سے - مرے گنہ کا حساب - اے خدا نہ مانگ

ردیف "ل"

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل !
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

آزادیِ نسیم مبارک - کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

جو تھا - سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے - نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا - کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل - سر بپائے گل

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے - نفسِ عطر سائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب - و - دلِ بے ہوائے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا - کہ آج تک
نے اختیار - دوڑے ہے گل - در قفائے گل

غالب - مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے - گلِ جیبِ قبائے گل

ردیف "م"

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے - گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بُتخانہ ہم

باوجودِ یک جہاں - ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضُعف سے ہی۔ نَے قناعت سے۔ یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمّتِ مردانہ ہم
دایم الحبس اسمیں ہیں لاکھوں تمنّائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینہ پُرخوں کو۔ زنداں خانہ ہم

بنالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر		متاعِ خانۂ زنجیر جُز صدا معلوم

مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مری خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہائے زلف کمیں میں ہیں۔ اے خدا
رکھ لیجو۔ میرے دعویِ وارستگی کی شرم

ردیفؔ "ن"

لوں - وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش - ولے
غالب - یہ خوف ہی - کہ کہاں سے ادا کروں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں
دل تو دل - وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق — واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے-کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر-اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں-پر-دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ-انھیں کچھ نہ کہو
جو مَے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے-ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟

ہے پرے سرحدِ ادراک سے-اپنا مسجود
قبلے کو-اہلِ نظر-قبلہ نُما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے

خارِ رہ کو ترے - ہم مہرِ گیا کہتے ہیں
اگ شرر دل میں ہی - اس سے کوئی گھبرائیگا کیا
آگ مطلوب ہی ہم کو - جو ہوا کہتے ہیں
دیکھئے - لاتی ہی اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ - ہم - "نامِ خدا" کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ - اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

آبرو کیا خاک - اُس گل کی - جو گلشن میں نہیں
ہی گریباں ننگِ پیراہن - جو دامن میں نہیں
ضعف سے اے گریہ - کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا - جو خوں - کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا

خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی۔ ساقی کی نخوت۔ قلزم آشامی مری
موجِ مے کی۔ آج رگ۔ مینا کی گردن میں نہیں
ہو فشارِ ضعف میں۔ کیا ناتوانی کی نمود ؟
قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا غالب۔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں۔ وہ مشتِ خس۔ کہ گلخن میں نہیں

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
گر اک ادا ہو۔ تو اُسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
میں۔ اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو۔ اور ایک وہ نشنیدن۔ کہ کیا کہوں
ظالم مرے گماں سے۔ مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے۔ خدا نہ کردہ۔ تجھے بیوفا کہوں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھکو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں؟

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

ڈھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

ہم پر جفا سے۔ ترکِ وفا کا گماں نہیں

اِک چھیڑ ہے۔ وگرنہ۔ مراد امتحاں نہیں

کس مُنہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا

پرسش ہے۔ اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز۔ ستمگر کو ہم عزیز

نامہرباں نہیں ہے۔ اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں۔ نہ دیجیے۔ دشنام ہی سہی

آخر زباں تو رکھتے ہو تم؟ گر دہاں نہیں

ہر چند۔ جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے

ہر چند۔ پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں

قطعہ

جاں مُطربِ ترانۂ ھَل مِن مزید ہی
لب۔ پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ۔ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھُری چبھو۔ مژہ گر خونچکاں نہیں

ہی ننگِ سینہ۔ دل اگر آتش کدہ نہو
ہی عارِ دل۔ نفَس۔ اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں۔ جنوں میں۔ بلا سے ہو گر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں۔ گراں نہیں

کہتے ہو۔ "کیا لکھا ہی تری سرنوشت میں؟"
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں؟

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
روح القُدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

جاں ہی بہائے بوسہ۔ ولے کیوں کہے ابھی؟
غالب کو جانتا ہی کہ وہ نیم جاں نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں۔ زنجیر نہیں

شوق اُس دشت میں دوڑاے ہے مجھکو۔ کہ جہاں
جادہ۔ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر۔ نہیں

حسرتِ لذتِ آزار۔ رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا۔ جز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدیِ جاوید۔ گوارا رہیو
خوش ہوں۔ گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہے۔ جہاں زخمِ سر اچھا ہو جاے
لذتِ سنگ۔ بہ اندازۂ تقریر نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی وگستاخی دے
کوئی تقصیر۔ بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالب۔ اپنا یہ عقیدہ ہے۔ بقولِ ناسخ
"آپ بے بہرہ ہے۔ جو معتقدِ میر نہیں"

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

بر شگالِ دیدۂ عاشق ہے۔ دیکھا چاہیے
کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

الفتِ گل سے۔ غلط ہے دعویِ وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی۔ گرفتارِ چمن

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت دست بہ دست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلّی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دلِ آشفتگاں خالِ کُنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اِک قدِّ آدم
قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

سُراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس۔ غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ملتی ہی خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں۔ گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں۔ کیا بتاؤں۔ جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا۔ پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے۔ آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام ؟

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو۔ فریب اُس پہ کیا چلے

کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں؟

ہیں مضطرب ہوں وصل میں۔ خوفِ رقیب سے

ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں؟

ہیں۔ اور خطِ وصل۔ خدا ساز بات ہے

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ۔ ایک چُرانا نگاہ کا

لاکھوں بناؤ۔ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ! دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے؟
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر! مدعا طلبی میں نہ کام آئے؟
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب۔ چھٹی شراب۔ پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لیے کر۔ آج۔ نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟

گر وہ صدا سمائی ہی - چنگ و رباب میں

رو میں ہی رخشِ عمر - کہاں دیکھیے تھمے -

نے ہاتھ باگ پر ہی - نہ پا ہی رکاب میں

اِتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے

جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود - ایک ہی

حیراں ہوں - پھر مشاہدہ ہی کس حساب میں

ہی مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر

یاں کیا دھرا ہی قطرہ و موج و حباب میں

شرم - اک ادائے ناز ہی - اپنے ہی سے سہی

ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہی آئینہ دایم نقاب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار

اے کاش۔ جانتا نہ ترے رہگذر کو میں
ہی کیا؟ جو کس کے باندھئے۔ میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں؟ تمھاری کمر کو میں
لو۔ وہ بھی کہتے ہیں "کہ یہ بے ننگ و نام ہی"
یہ جانتا اگر۔ تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر ایک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں؟
پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دِن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

ذکر میرا - بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

وعدہ سیرِ گلستاں ہی - خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں "کہ ہی" - پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہی دریا - لیکن

ہم کو تقلیدِ تُنک ظرفیِ منصور نہیں

حسرت۔ اے ذوقِ خرابی۔ کہ وہ طاقت نہ رہی

عشقِ پرعربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں "کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں"

کس رعونت سے وہ کہتے ہیں "کہ ہم حور نہیں"

ظلم کر ظلم۔ اگر لطف دریغ آتا ہو

تو تغافل میں۔ کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ

وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں۔ ظہوری کے مقابل میں۔ خفائی غالب

میرے دعوے پہ یہ حجّت ہے کہ مشہور نہیں

نالہ جُز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہی تقاضائے جفا۔ شکوۂ بیداد نہیں

عشق۔ و۔ مزدوریِ عشرتگہ خسرو۔ کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں۔ پہ وسعت معلوم
دشت میں ہی مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہی طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج۔ کم از سیلیِ اُستاد نہیں

وائے محرومیِ تسلیم۔ و۔ بد احوالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

رنگِ تمکینِ گل و لالہ۔ پریشاں کیوں ہی؟

گر۔ چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں؟

سبزۂ گل کے تلے بند کرے ہی گلچیں

مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیّاد نہیں

نفی سے کرتی ہی۔ اثبات۔ تراوش گویا

دی ہی۔ جاے دہن۔ اسکو دم ایجاد "نہیں"

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے بہشت

یہی نقشہ ہی۔ ولے۔ اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

تم کو بےمہرئ یارانِ وطن یاد نہیں؟

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے کہ خوش رہا

یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں۔ تو ناچار۔ کیا کریں؟

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ۔ اہلِ بزم؟
ہو غم ہی جانگداز۔ تو غمخوار کیا کریں؟

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں"

دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اُس کافر کو الفت آزمانے میں

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

ہیں زوال آمادہ - اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہی چراغِ رہگذارِ باد-یاں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو - کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے - خدا کی قدرت ہی
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں - اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم - اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

نہیں - کہ مجھکو قیامت کا اعتقاد نہیں | شبِ فراق سے - روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے "کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے"
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو۔ تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں۔ تو کہتے ہیں
"کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو۔ خدا نے وہ دل۔ کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدہ کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا؟ کہ تم کہو۔ اور وہ کہیں "کہ یاد نہیں"

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کو ہوا باندھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

نشّۂ رنگ سے ہی۔ واشُدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

غلطی ہاے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی وا ماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں۔ خوباں۔ غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں ؟
خاک ایسی زندگی پہ۔ کہ پتّھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جاے دل ؟
انسان ہوں۔ پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب۔ زمانہ مجھکو مٹاتا ہی کس لیے ؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہگار ہوں۔ کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟

لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟

رتبے میں مہ و مہر سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھکو منعِ قدمبوس کس لیے؟

کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب ۔ وظیفہ خوار ہو۔ دو شاہ کو دعا

وہ دن گئے۔ کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

سب کہاں۔ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں

شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں؟

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر

لیکن آنکھیں - روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش - پر زنانِ مصر سے

ہے زلیخا خوش! کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو - کہ ہے شامِ فراق

میں یہ سمجھوں گا - کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

نیند اُسکی ہے، دماغ اُسکا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھُل گیا
بلبلیں سنکر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار؟
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

واں گیا بھی میں، تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب

یاد تھیں جتنی دعائیں۔ صرفِ درباں ہو گئیں

جانفزا ہے بادہ۔ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں۔ ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں۔ اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں۔ تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

دیوانگی سے دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا اگر نہیں ترا آساں۔ تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے۔ کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے۔ اور یہاں
طاقت۔ بقدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں۔ اے خدا۔ کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ۔ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا؟
لڑتے ہیں۔ اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے۔ تو ہشیار بھی نہیں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس۔ رشتہ چشمِ سوزن میں

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا۔ خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستریِ میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو۔ جو رکھدیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش۔ مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب۔ بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پُر افشاں۔ جوہرِ آئینہ میں مثلِ ذرّہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے

جو گُل ہوں۔ تو ہوں گلخن میں۔ جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھکو
سیہ ہوکر۔ سویدا ہوگیا۔ ہر قطرہ خوں تن میں

اسدؔ۔ زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش۔ ہوگیا ہے طوق۔ گردن میں

مرے جہان کے۔ اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر۔ سو۔ جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوے پر۔ ہوا اُڑالے جائے
وگرنہ۔ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟
کہ غیر جلوۂ گل رہگذر میں۔ خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی۔ کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شرابخانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر۔ گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا۔ کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے۔ نہ سنگ و خشت۔ درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار۔ کوئی ہمیں ستائے کیوں

دَیر نہیں۔ حرم نہیں۔ در نہیں آستاں نہیں

بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم۔ غیر ہمیں اُٹھائے کیوں
جب وہ جمالِ دلفروز۔ صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز۔ پردے میں منہ چھپائے کیوں؟
دشنۂ غمزہ۔ جانستاں۔ ناوکِ ناز۔ سے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی۔ سامنے تیرے آئے کیوں؟
قیدِ حیات و بندِ غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی۔ غم سے نجات پائے کیوں
حسن اور اُس پہ حُسنِ ظن۔ رہگئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے۔ غیر کو آزمائے کیوں
واں وہ غرورِ عزّ و ناز۔ یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بُلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست ۔ جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہوں دین و دل عزیز ۔ اُس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا ۔ کیجیے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو ۔ دُور سے مت دکھا ۔ کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں ۔ منہ سے مجھے بتا ۔ کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا ۔ کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے ۔ ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے ۔ پر نہ کرے خدا کہ یوں

"غیر سے رات کیا بنی" ۔ یہ جو کہا ۔ تو دیکھیے

سامنے آن بیٹھنا۔ اور یہ دیکھنا۔ کہ یوں

بزم میں اُسکے روبرو۔ کیوں نہ خموش بیٹھے

اُس کی تو خامشی میں بھی۔ ہے یہی مدّعا کہ یوں

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"

سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا۔ کہ یوں

غیر سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح؟"

دیکھ کے میری بیخودی۔ چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں۔ رہنے کی وضع یاد تھی؟

آئینہ دار بن گئی۔ حیرتِ نقشِ پا۔ کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ "ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی"
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

ردیف (و)

حسد سے دل اگر افسردہ ہے۔ گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ۔ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن۔ گر آبِ ہفت دریا ہو

اگر وہ سروقد۔ گرمِ خرامِ ناز آ جاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن۔ شکلِ قُمری نالہ فرسا ہو

کعبہ میں جا رہا۔ تو نہ دو طعنہ۔ کیا کہیں

بھولا ہوں۔ حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو؟
طاعت میں۔ تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو۔ کوئی لیکر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟
ٹیڑھا لگا ہے قط۔ قلمِ سرنوشت کو
غالب۔ کچھ اپنی سعی سے۔ لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے۔ اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ اس سے ہیں۔ کہ محبت ہی کیوں نہو
کیجے ہمارے ساتھ۔ عداوت ہی کیوں نہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار۔ نقشِ محبت ہی کیوں نہو

ہی مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہو

ہی آدمی بجائے خود۔ اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں۔ خلوت ہی کیوں نہو

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہی۔ انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہو

وارستگی۔ بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر۔ نہ غیر سے۔ وحشت ہی کیوں نہو

مٹتا ہی فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی؟

عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہو
اُس فتنہ خُو کے دَر سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہو

قفس میں ہوں۔ گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہی نواسنجانِ گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں۔ نہو۔ یہ رشک کیا کم ہی؟
نہ دی ہوتی خدایا۔ آرزوئے دوست دشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اِک آنسو۔ اُس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو۔ کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو۔ کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آسان سمجھے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوے خوں میں تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بے تاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو
خوشی کیا۔ کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں۔ کہ ڈھونڈے ہی ابھی سے برقِ خرمن کو
وفاداری بہ شرطِ استواری۔ عینِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں۔ تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
شہادت تھی مری قسمت میں۔ جو دی تھی یہ خو مجھکو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو
نہ لٹتا دن کو۔ تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا

رہا کھٹکا نہ چوری کا۔ دعا دیتا ہوں رہزن کو
سخن کیا کہہ نہیں سکتے؟ کہ جویاں ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے۔ کہ کھودیں جا کے معدن کو
مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ
فریدون و جم و کیخسرو و دارا و بہمن کو

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو
رکھتا ہی ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو
دی سادگی سے جان۔ پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات۔ کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت۔ سو اُسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر۔ دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں۔ اس خستہ تن کے پانو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بہ خود مرے اندر کفن کے پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک۔ کہ ہر طرف
اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں۔ مرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اُس بتِ نازک بدن کے پانو

غالب مرے کلام میں کیونکر مزہ نہ ہو؟
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

واں اُس کو ہول دل ہے۔ تو یاں میں ہوں شرمسار

یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں۔ ذوقِ ستم کو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

واں پہنچکر جو غش آتا پئے ہم ہی ہمکو
صد رہ۔ آہنگِ۔ زمیں بوس قدم ہی ہمکو

دل کو میں۔ اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہی
کسقدر ذوقِ گرفتاریِ ہم۔ ہی ہمکو

ضعف سے نقش پئے مور ہی طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہی ہمکو

جانکر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز۔ تو سم ہی ہمکو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثر بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر۔ تیغِ دو دم ہی ہمکو

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہی ہمکو"

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ۔ ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہی ہمکو

تم وہ نازک۔ کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہی ہمکو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا۔ سو وہ کم ہی ہمکو

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہی یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہی ہمکو

لیے جاتی ہی کہیں۔ ایک توقّع غالب
جادۂ رہ۔ کششِ کافِ کرم ہی ہمکو

تم جانو تمکو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھکو بھی پوچھتے رہو۔ تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہی۔ تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بیگنہ کشِ وحق ناسپاس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں۔ خورشید و ماہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہی اُنکے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا۔ تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو۔ مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف۔ سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو۔ تو کچھ ایسا ضرر نہیں

دنیا ہو یارب۔ اور مرا بادشاہ ہو

گئی وہ بات۔ کہ ہو گفتگو۔ تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہی نام۔ وصال
کہ گر نہ ہو۔ تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ادب ہی اور یہی کشمکش۔ تو کیا کیجے
حیا ہی اور یہی گو مگو تو کیونکر ہو

تمھیں کہو۔ کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو۔ تو کیونکر ہو

اُلجھتے ہو تم۔ اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمیں پھر اُن سے امید، اور اُنھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلّی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

بتاؤ اُس مژہ کو دیکھکر ہو مجھکو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں **غالب** ۔ ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو ۔ تو کیونکر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو

نہو جب دل ہی سینہ میں۔ تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے۔ ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں۔ کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رُسوا۔ لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی۔ کہاں کا عشق۔ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل۔ تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی۔ وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو۔ تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہی جذبِ دل کا شکوہ۔ دیکھو جُرم کِس کا ہی
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہی؟
ہوے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہی آزمانا۔ تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لیے جب تم۔ تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے۔ کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"
بجا کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو۔ پھر کہیو۔ کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہی کام کیا طعنوں سے تو۔ غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ہم سخن کوئی نہو اور ہمزباں کوئی نہو
نے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

کوئی ہمسایہ نہو اور پاسباں کوئی نہو
پڑیئے گر بیمار۔ تو کوئی نہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہو

ردیف "ہ"

از مہر تا بہ ذرّہ۔ دل و دل ہی آئنہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہی آئنہ

ہی سبزہ زار ہر در و دیوار غم کدہ
جسکی بہار یہ ہو۔ پھر اُسکی خزاں نہ پوچھ

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اُٹھایئے
دشواریِ رہ و ستمِ ہمزباں نہ پوچھ

ردیف "ی"

صد جلوہ روبرو ہی جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں - کہ دید کا احساں اُٹھائیے

ہی سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منّتِ طفلاں اُٹھائیے

دیوار - بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجئے
یا پردہ تبسّمِ پنہاں اُٹھائیے

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ - قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

سیکھیں ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہی کس روسیاہ کو؟
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

ہی رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سرِ پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات

رُو سوئے قبلہ - وقتِ مناجات چاہیے
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے - غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے - جو بات چاہیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں - وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن - سرنگوں وہ بھی

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم - چندے تکلّف سے
تکلّف برطرف - تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ - کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنّا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ - مجھکو کیا معلوم تھا ہمدم

کہ ہوگا باعثِ افزایشِ دردِ دروں وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ وارگوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا
یک بار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ مے کدہ گستاخ ہیں۔ زاہد
زنہار نہ ناطرف۔ ان نے ادبوں سے

بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

تا۔ ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں۔ گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

غالب۔ ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلا لیں۔ یہ اجارا نہیں کرتے

گھر میں تھا کیا؟ کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم۔ اِک حسرتِ تعمیر۔ سو ہے

غمِ دُنیا سے۔ گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی

فلک کا دیکھنا۔ تقریب تیرے یاد آنے کی
کھُلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا پنہاں ہے
ولے مشکل ہے حکمت۔ دل میں سوزِ غم چھپانے کی
اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو۔ دیکھنا شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی۔ التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا۔ ظالم۔ مگر تمہید جانے کی
لکد کوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی
مری طاقت۔ کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اُٹھانے کی

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ اَبنائے زمان غالب
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی۔ بارہا نیکی

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ۔ اے آرزو خرامی
دِل جوشِ گریہ میں ہی۔ ڈوبی ہوئی اَسامی
اُس شمع کی طرح سے۔ جس کو کوئی بُجھاوے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہی!
جسمیں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہی

ہی کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہی

حالانکہ ہی یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہی

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند؟ کہ ٹھنڈا مکان ہی

کیا خوب۔ تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چُپ رہو۔ ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہی

بیٹھا ہی جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہی

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں - کہ داغِ جگر کا نشان ہی

ہی بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالب - ہم اس میں خوش ہیں - کہ نامہربان ہی

درد سے میرے ہی تجھکو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھکو آیا تھا خیال ؟
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا

عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئے
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہاے تارِ برشکال
ہی نظر خو کردہ اختر شماری - ہاے ہاے

گوش - مہجورِ پیام - و - چشم - محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہاے ہاے

عشق نے - پکڑا نہ تھا - غالب - ابھی الفت کا رنگ
رہگیا - تھا دل مین جو کچھ ذوقِ خواری ہاے ہاے

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہی
تسکین کو دے نوید - کہ مرنے کی آس ہی

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
ابتک وہ جانتا ہی - کہ میرے ہی پاس ہی

کیجے بیاں سرورِ تپِ غم - کہاں تلک
ہر مو - مرے بدن پہ - زبانِ سپاس ہی

ہی وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اُس کے پاس - دلِ حق شناس ہی

پی جسقدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہی

ہر اک مکان کو ہی مکیں سے شرف۔ اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہی۔ تو جنگل اُداس ہی

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہی
خوش ہوں۔ کہ میری بات سمجھنی محال ہی

کس کو سُناؤں حسرتِ اظہار کا گِلہ
دِل۔ فردِ جمع و خرجِ زباں ہائے لال ہی

کس پردے میں ہی آئنہ پردازِ اے خدا
رحمت۔ کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہی

ہی ہی خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل۔ یہ تجھے کیا خیال ہی

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان

نافِ زمین ہے۔ نہ کہ نافِ غزال ہے

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو۔ اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دِل سے کہ اِس میں آگ بھری ہے

دِلا یہ درد و الم بھی تو مُغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو وہ بھی مِٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں؟
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہی
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہی صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہی
ہی وہی بدمستیِ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہی
مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہی
آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہی کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہی

پنس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

مری ہستی - فضائے حیرت آبادِ تمنّا ہی
جسے کہتے ہیں نالہ - وہ اسی عالم کا عنقا ہی

خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کسکو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہی - اور ماتم بال و پر کا ہی

وفائے دلبراں ہی اتّفاقی - ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہی؟

نہ لائے شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنّا ہی

رحم کر ظالم - کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہی
نبضِ بیمار وفا دودِ چراغِ کشتہ ہی

دل لگی کی آرزو بیچین رکھتی ہی ہمیں
ورنہ یاں لے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہی

چشمِ خوباں - خامشی میں بھی نوا پرواز ہی

سُرمہ۔ تو کہوے کہ دُودِ شعلۂ آواز ہی
پیکرِ عُشّاق سارا طالعِ ناساز ہی
نالہ۔ گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہی
دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل۔ فرشِ پا انداز ہی

عشق مجھکو نہیں۔ وحشت ہی سہی
میری وحشت۔ تیری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلّق ہم سے
کچھ نہیں ہی۔ تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہی کیا رُسوائی ؟
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبّت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر۔ ہر چند کہ ہی۔ برقِ خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں؟
نہ سہی عشق۔ مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے۔ اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل۔ تو حسرت ہی سہی

ہی آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہی خندۂ دنداں نما مجھے

ڈھونڈھے ہی اس مغنّیِ آتش نفس کو جی
جسکی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طی کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا۔ بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

کرتا ہی بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہی نکہتِ گل سے حیا مجھے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

زندگی اپنی۔ جب اس شکل سے گذری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا۔ اگرچہ اشارے ہوا کئے

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں۔ اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہنِ مے
مدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

بے صرفہ ہی گذرتی ہے۔ ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ "او لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے"؟

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو ؟
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے ؟

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہی بوسہ بغیر التجا کیے

ضد کی ہی اور بات۔ مگر خو بُری نہیں
بھولے سے اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہا کیے

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہی
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہی

مینائے مے ہی سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو و جلوۂ موجِ شراب ہی

زخمی ہوا ہی پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گون نہ اقامت کی تاب ہی

جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہی شش جہت
غافل گماں کرے ہی۔ کہ گیتی خراب ہی

نظّارہ کیا حریف ہو اُس برق حُسن کا
جوشِ بہار۔ جلوے کو جس کے نقاب ہی

میں۔ نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا۔ کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہی

گذرا اسد۔ مسرّتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھکو رشکِ سوال و جواب ہی

دیکھنا قسمت۔ کہ آپ اپنے پہ رشک آجاے ہی
میں اُسے دیکھوں؟ بھلا کب مجھ سے دیکھا جاے ہی

ہاتھ دھو دل سے۔ یہی گرمی گر اندیشے میں ہی
آبگینہ۔ تُندیِ صہبا سے پگھلا جاے ہی

غیر کو۔ یارب۔ وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہی۔ تو شرما جاے ہی

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جاے ہی

دُور چشمِ بد۔ تری بزمِ طرب سے۔ واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہی واں۔ گر نالہ میرا جاے ہی

گرچہ ہی طرزِ تغافل۔ پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوے جاتے ہیں۔ کہ وہ پا جاے ہی

اُس کی بزم آرائیاں سُنکر۔ دلِ رنجور۔ یاں
مثلِ نقشِ مدعاے غیر۔ بیٹھا جاے ہی

ہو کے عاشق۔ وہ پری رُخ۔ اور نازک بن گیا
رنگ کھُلتا جاے ہی۔ جتنا کہ اُڑتا جاے ہی

نقش کو اُس کے۔ مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں

کھینچتا ہی جسقدر - اتنا ہی کھنچتا جاے ہی
سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہی اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھیرا جاے ہی

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے
نسیہ نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائی وحدت ہی پرستاریِ وہم
کردیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گل کا - تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

کارگاہِ ہستی میں - لالہ - داغ ساماں ہی
برقِ خرمنِ راحت - خونِ گرمِ دہقاں ہی
غنچہ تا شگفتن ہا - برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی - خوابِ گل پریشاں ہی
ہم سے - رنجِ بیتابی کسطرح اُٹھایا جاے؟
داغِ پشتِ دستِ عجز - شعلہ خس بدنداں ہی

اُگ رہا ہی در و دیوار سے سبزہ غالب

ہم بیاباں میں ہیں۔ اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی پہ اُس کی۔ مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا۔ کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے۔ با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
بس ہجومِ ناامیدی۔ خاک میں مِل جائے گی
یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم۔ منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہی
ہی دلِ شوریدہ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہی

دل آپ کا ؟ کہ دل میں جو کچھ ہی سب آپ کا ؟
دل لیجئے - مگر مرے ارماں نکال کے

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہی سینہ - خوشا لذّتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں ؟
اُٹھئے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہی خاک مری کوے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر چند ہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی؟

"تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں۔ لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو۔ اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں۔ کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا۔ کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار۔ دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہی نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہی

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہی

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہی

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہی
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہی کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی؟

کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہی پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤگے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہی؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہی؟

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہی؟

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہی؟

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہی؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہی؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہی؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہی؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہی؟ ہوا کیا ہی؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امّید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر۔ ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا۔ کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی۔ کہ وہ آئے

ہوں کشمکشِ نزع میں۔ ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں۔ پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی۔ سمجھ میں مری آتا نہیں۔ گو۔ آئے

ظاہر ہی کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں مُنہ سے مگر بادۂ و شیشہ کی بُو آئے

جلاّد سے ڈرتے ہیں۔ نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے۔ جس بھیس میں وہ آئے

ہاں۔ اہلِ طلب۔ کون سُنے طعنۂ نا یافت
دیکھا کہ۔ وہ ملتا نہیں۔ اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ۔ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار۔ تو کعبے ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے۔ مگر مجھکو ڈبو آئے

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب

ہم بھی گئے واں - اور تری تقدیر کو رو آئے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہی
سینہ جویائے زخم کاری ہی

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہی

قبلۂ مقصدِ نگاہ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہی

چشمِ دلّال - جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہی

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشکباری ہی

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بیقراری ہی

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہی
روزِ بازارِ جاں سپاری ہی

پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہی

ق

پھر کھلا ہی درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہی

ہو رہا ہی جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہی

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہی

پھر ہوے ہیں گواہِ عشق طلب
اشکباری کا حکم جاری ہی

دل و مژگاں کا جو مقدّمہ تھا
آج پھر اُن کی روبکاری ہی

بیخودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہی جسکی پردہ داری ہی

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہو۔ گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہی۔ لذت زندگانی کی

کشاکش ہاے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو۔ فرصت روانی کی

پس از مُردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہی

شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گُل فشانی کی

نکوہش ہے- سزا- فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نُما ہو صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو- خاکِ دشتِ مجنوں- ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ- دہقاں نوک نشتر کی

پرِ پروانہ- شاید بادبانِ کشتیِ مَے تھا
ہوئی- مجلس کی گرمی سے روانی دَورِ ساغر کی

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی- عرض- کیا قدرت
کہ طاقت اُڑ گئی- اُڑنے سے پہلے- میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اُسکے خیمے کے پیچھے- قیامت ہے
مری قسمت میں یارب- کیا نہ تھی دیوار پتھّر کی

نے اعتدالیوں سے۔ سُبک سب میں ہم ہوے
جتنے زیادہ ہو گئے۔ اُتنے ہی کم ہوے

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پاے تھے کہ گرفتار ہم ہوے

ہستی ہماری۔ اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مِٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوے
اللہ ری تیری تُندیِ خُو۔ جس کے بیم سے
اجزاے نالہ۔ دل میں مرے رزقِ ہم ہوے

اہلِ ہوس کی فتح ہی۔ ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے۔ وہی اُن کے الم ہوے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے۔ سو وہ یاں آ کے دَم ہوے

چھوڑی اسد۔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوے۔ تو عاشقِ اہلِ کرم ہوے

جو۔ نہ نقدِ داغِ دِل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہی۔ بہ کمینِ بے زبانی

مجھے اُس سے کیا توقع - بزمانہ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے - نہ سنی مری کہانی
یونہیں دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب - ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب - ملے میری زندگانی

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر - سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال - نہ نظّارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق - یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا

کیا اوجِ پرستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ - حوصلہ ساقی - نگاہ مست
بزمِ خیال - میکدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار - اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے - جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سُنو - جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ - دشمنِ ایمان و آگہی
مُطرب بہ نغمہ - رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا۔ شب کو دیکھتے تھے۔ کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہی

لطفِ خرامِ ساقی و۔ ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ۔ وہ فردوسِ گوش ہی

یا۔ صبح دم جو دیکھیے۔ آ کر۔ تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہی

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہی۔ سو وہ بھی خموش ہی

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب۔ صریرِ خامہ۔ نوائے سروش ہی

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی۔ نہ سہی

امتحاں اور بھی باقی ہو۔ تو۔ یہ بھی نہ سہی

خار۔ خارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے

شوق۔ گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی

مے پرستاں۔ خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنی

ایک دِن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

نَفَسِ قیس۔ کہ ہے چشم و چراغِ صحرا

گر نہیں۔ شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ۔ نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے۔ گھر کی رونق

نوحۂ غم ہی سہی۔ نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستایش کی تمنّا۔ نہ صِلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی۔ نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ - اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پانوں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط "خراب" لکھا - بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

خدا کے واسطے - داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے

تمھارے آئیو۔ اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے
دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں۔ سمجھے ہوے تھے اسکو دم آگے
قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں۔ غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ۔ کہ جو کہیے۔ تو گلا ہوتا ہے
پُر ہوں میں شکوے سے یوں۔ راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے۔ پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں۔ پر حُسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہی چرخ مکوکب کی وہ چال
سست رَو۔ جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہی

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد؟ کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں۔ گر تیر خطا ہوتا ہی

خوب تھا۔ پہلے سے ہوتے۔ جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں۔ اور بُرا ہوتا ہی

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا۔ اور اب
لب تک آتا ہی۔ جو ایسا ہی رسا ہوتا ہی

قطعہ

خامہ میرا۔ کہ وہ ہی بار بُدِ بزم سخن

شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہی

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہر علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہی

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے ۔ نعل بہا ہوتا ہی

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہی ہلال
آستاں پر ترے ۔ مہ ۔ ناصیہ سا ہوتا ہی

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ۔ ذوق فزا ہوتا ہی

رکھیو غالب ۔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہی

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم "کہ تو کیا ہی"
تمھیں کہو۔ کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہی

نہ شعلے میں یہ کرشمہ۔ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ۔ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہی

یہ رشک ہی۔ کہ وہ ہوتا ہی ہم سخن تم سے
وگرنہ۔ خوفِ بد آموزیِ عدو۔ کیا ہی

چپک رہا ہی بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو۔ اب حاجتِ رفو کیا ہی

جلا ہی جسم جہاں۔ دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو۔ اب راکھ جستجو کیا ہی

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قایل

جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا۔ تو پھر لہو کیا ہی

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو۔ کیا ہی

پیوں شراب۔ اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو۔ کیا ہی

رہی نہ طاقتِ گفتار۔ اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے۔ کہ آرزو کیا ہی

ہوا ہی شہ کا مصاحب پھرے ہی اتراتا
وگرنہ شہر میں۔ غالب کی آبرو کیا ہی

ہیں اُنھیں چھیڑوں۔ اور کچھ نہ کہیں قہر ہو۔ یا بلا ہو۔ جو کچھ ہو	چل نکلتے۔ جو مَے پیے ہوتے کاشکے۔ تم مرے لیے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

آہی جاتا - وہ راہ پر - **غالب**
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

آ - کہ مری جان کو قرار نہیں ہی
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہی

دیتے ہیں جنّت حیاتِ دہر کے بدلے
نشّہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہی

گریہ نکالے ہی تری بزم سے مجھکو
ہاے - کہ رونے پہ اختیار نہیں ہی

ہم سے عبث ہی - گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشّاق کی غبار نہیں ہی

دِل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہی
قتل کا میرے عہد تو کیا ہی بارے
واے۔ اگر عہد اُستوار نہیں ہی
تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہی غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہی

ہجومِ غم سے۔ یاں تک سرنگونی مجھکو حاصل ہی
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہی
رفوے زخم سے مطلب ہی لذّت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت۔ کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہی
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب

چٹکنا غنچۂ دل کا صدائے خندۂ دل ہے
پابہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مائگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھکو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سُوکھ گئی پیاس سے یارب
اِک آبلہ پا۔ وادیِ پُرخار میں آوے

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زُنّار میں آوے

غارتگرِ ناموس نہ ہو۔ گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گُل باغ سے بازار میں آوے

تب۔ چاکِ گریباں کا مزہ ہی۔ دلِ نالاں
جب۔ اِک نفسِ اُلجھا ہوا تار میں آوے

آتشکدہ ہی سینہ مرا۔ رازِ نہاں سے
اے وائے۔ اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ۔ غالب۔ مرے اشعار میں آوے

حُسنِ مہ۔ گرچہ بہ ہنگامِ کمال۔ اچھا ہی
اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہی

بوسہ دیتے نہیں۔ اور دل پہ ہی ہر لحظہ نگاہ

جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے۔ تو مال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے۔ اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
بے طلب دیں۔ تو مزہ اُس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا۔ جسکو نہ خُوے سوال اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق مُنھ پر
وہ سمجھتے ہیں۔ کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھیے۔ پاتے ہیں عشّاق۔ بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال۔ اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو ملجائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہی وہ۔ جس کا کہ مآل اچھا ہی

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہی

ہم کو معلوم ہی جنّت کی حقیقت۔ لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب۔ یہ خیال اچھا ہی

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ۔ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

خط لکھیں گے۔ گرچہ مطلب کچھ نہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے۔ اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا۔ مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حمّام کے

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطّۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیں دار نے شفا پائی

تغافل دوست ہوں۔ میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی۔ زبانی میری

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ۔ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر۔ آشفتہ بیانی میری

ہوں ز خود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا
رُک گیا۔ دیکھ۔ روانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گردِ بادِ رہِ بے تابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا | کھل گئی ہیچمدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز۔ غالب
ننگِ پیری ہی جوانی میری

نقشِ نازِ بُتِ طنّاز۔ بہ آغوشِ رقیب
پاے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

تُو۔ وہ بدخُو۔ کہ تحیّر کو۔ تماشا جانے
عم وہ افسانہ۔ کہ آشفتہ بیانی مانگے

وہ تپِ عشق۔ تمنّا ہی۔ کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ۔ تا نبضِ جگر۔ ریشۂ دوانی مانگے

گلشن کو تری صحبت۔ از بسکہ خوش آئی ہی
ہر غنچے کا گُل ہونا۔ آغوش کُشائی ہی

۔ چاہیے

واں کُنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اور اُلٹا دعوائے رسائی ہے
ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیرِ رفو کی
لکھ دیجیو یارب۔ اُسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصوّر
دل میں نظر آتی تو ہے۔ اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
کبھی مُنہ نہ لگایا ہو جگر کو

خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
صد حیف - وہ ناکام - کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بُتِ عُربدہ جُو کی

سیماب پُشت گرمیِ آئینہ دے ہی ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے
آغوشِ گل - کشودہ - برائے وداع ہی
اے عندلیب چل - کہ چلے دن بہار کے

ہی - وصلِ ہجر - عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو - ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں۔ تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دشمنی نے میری۔ کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے۔ دیکھا چاہیے

اپنی رسوائی میں۔ کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیے

غافل۔ ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو۔ اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

ہر قدم دوریِ منزل ہی نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہی بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا۔ بہ تغافل۔ خوشتر
ہی نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود۔ رہا سایہ گریزاں مجھ سے

غمِ عشّاق نہو۔ سادگی آموزِ بتاں
کسقدر خانۂ آئینہ ہی ویراں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے۔ جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہی چراغاں مجھ سے

نے خودی بستر تمہیدِ فراغت ہو۔ جو

پُر ہی سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ مثلِ گُلِ شمع پریشاں مجھ سے
بے کسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت - ہَے ہَے
سایہ - خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئنہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے
نگہِ گرم سے - اک آگ ٹپکتی ہے - اسد
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے
نکتہ چیں ہے - غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات - جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو۔ مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے۔ کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے۔ لیے یوں۔ ترے خط کو۔ کہ اگر
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے؟" تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو۔ وہ بھلے ہیں۔ تو کیا
ہاتھ آئیں۔ تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون۔ کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے

تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہی کہ اُٹھائے نہ اُٹھے

کام وہ آن پڑا ہی کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں۔ ہی یہ وہ آتش۔ غالب
کہ لگائے نہ لگے۔ اور بجھائے نہ بنے

چاک کی خواہش اگر وحشت بُعریانی کرے
صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہی۔ کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو۔ زیارت گاہِ حیرانی۔ کرے

ہی شکستن سے بھی دل نومید۔ یارب کب تلک
آبگینہ۔ کوہ پر عرضِ گرانِ جانی کرے

میکدہ۔ گر چشمِ مستِ ناز سے پائے شکست
موئے شیشہ۔ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِّ عارض سے لکھا ہی۔ زلف کو الفت نے عہد
"یک قلم منظور ہی"۔ جو کچھ پریشانی کرے

وہ آ کے خواب میں۔ تسکینِ اضطراب تو دے
وَلے۔ مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہی قتل۔ لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو۔ آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی۔ تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ۔ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی۔ جو ہم سے نفرت ہے

پیالہ گر نہیں دیتا۔ نہ دے۔ شراب تو دے

اسد۔ خوشی سے مرے ہاتھ پانوں پھول گئے

کہا جو اُس نے۔ ذرا۔ میرے پانوں داب تو دے

تپش سے میری۔ وقفِ کشمکش۔ ہر تارِ بستر ہے

مرا سر رنج بالیں ہے۔ مرا تن بارِ بستر ہے

رشکِ سر بصحرا دادہ۔ نورالعین دامن ہے

دلِ بے دست و پا اُفتادہ برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری۔ عیادت کو تم آئے تو

فروغِ شمعِ بالیں۔ طالعِ بیدارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہی بو بالش سے اُسکی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو۔ خوابِ زلیخا۔ عارِ بستر ہی

کہوں کیا۔ دلکی کیا حالت ہی ہجرِ یار میں۔ غالبؔ
کہ بے تابی سے۔ ہر اک تارِ بستر۔ خارِ بستر ہی

خطر ہی۔ رشتۂ الفت۔ رگِ گردن نہو جائے
غرورِ دوستی۔ آفت ہی۔ تو دشمن نہ ہو جائے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما۔ غالبؔ
اگر گل۔ سرو کے قامت پہ پیراہن نہو جائے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہی
نالہ۔ پابندِ نَے نہیں ہی

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے ؟
گر باغ گدائے مے نہیں ہی

ہر چند۔ ہر ایک شَے میں تو ہی
پر تجھ سی کوئی شَے نہیں ہی

ہاں۔ کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں "کہ ہے" نہیں ہے

شادی سے گزر۔ کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دی۔ نہیں ہے

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد؟
مے ہے۔ یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے۔ نہ کچھ عدم ہے۔ غالب
آخر تو کیا ہے؟ اے "نہیں ہے"

نہ پوچھ نسخہ مرہم۔ جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ۔ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں۔ ولے اُن کی تمنّا نہیں کرتے

در پردہ اُنھیں غیر سے ہی ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہی کہ پردا نہیں کرتے

یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہی
غالب کو بُرا کہتے ہو - اچّھا نہیں کرتے

کرے ہی بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہی

کبھی تو اِس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہی

بجا ہی - گر نہ سُنے نالہاے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل - نمِ شبنم سے - پُنبہ آگیں ہی

اسد ہی نزع میں - چل بیوفا برائے خدا

مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہی

کیوں نہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہو
یعنی اِس بیمار کو۔ نظارے سے پرہیز ہی

مرتے مرتے۔ دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی۔ کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہی

عارضِ گل دیکھ۔ روئے یار۔ یاد آیا۔ اسد
جوششِ فصلِ بہاری۔ اشتیاق انگیز ہی

دیا ہی دل اُس کو اگر۔ بشر ہی۔ کیا کہیے
ہوا رقیب۔ تو ہو۔ نامہ بر ہی۔ کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آئے۔ اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہی۔ کیا کہیے

رہے ہی یوں گہہ و بے گہہ کوے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہی - کیا کہیے ؟

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہی ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی اُنھیں سب خبر ہی - کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پُرسشِ حال
کہ یہ کہے، کہ سرِ رہ گزر ہی - کیا کہیے

تمھیں نہیں ہی سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہی، مگر ہی کیا ؟ کہیے!

اُنھیں سوال پہ زُعمِ جنوں ہی کیوں لڑیے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہی - کیا کہیے

حسد سزائے کمالِ سخن ہی - کیا کیجے

ستم - بہائے متاعِ ہنر ہی - کیا کہیے
کہا ہی کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں، لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہی - کیا کہیے

دیکھکر درپردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستہ تن میری عُریانی مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں، کیا مبارک ہی گرانجانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی، اُس کی خاطر جمع ہی
جانتا ہی محوِ پُرسش ہائے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا من جملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہی وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے

اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا

لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہی

تم نے کیوں سونپی ہی میرے گھر کی دربانی مجھے

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ! واہ!!

پھر ہوا ہی تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

دی مرے بھائی کو، حق نے از سرِ نو زندگی

میرزا یوسف ہی غالب، یوسفِ ثانی مجھے

یاد ہی شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے

سُبحہ زاہد ہوا ہی خندہ زیرِ لب مجھے
ہی کُشادِ خاطرِ وابستہ در، رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مجھے
یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
رشک، آسائش پہ ہی زندانیوں کی اب مجھے
طبع ہی مشتاقِ لذت ہائے حسرت، کیا کروں
آرزو سے ہی، شکستِ آرزو مطلب مجھے
دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہی
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہی

قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں، آخر
ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیّو پھر، کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر، اچھا۔ جگر کے پار ہو، بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سُبحہ و زنّار کے پھندے میں، گیرائی

وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ۔ اے دلِ وابستہ بے تابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرماجائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی۔ مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخو، اور میری داستانِ عشق، طولانی
عبارت مختصر۔ قاصد بھی گھبرا جاے ہی مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہی۔ اِدھر یہ ناتوانی ہی
نہ پوچھا جاے ہی اُس سے نہ بولا جاے ہی مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہی
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جاے ہی مجھ سے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی۔ لیکن
وہ دیکھا جاے کب۔ یہ ظلم دیکھا جاے ہی مجھ سے

ہوے ہیں پانوں ہی پہلے۔ نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جاے ہی مجھ سے۔ نہ ٹھہرا جاے ہی مجھ سے

قیامت ہی کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب

وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے
کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

نہ جانوں، کیوں کہ مٹے داغِ طعنِ بد عہدی
تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے

بہ پیچ و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہی۔ کہ اُس کو دیکھکر آجاے رحم
واں تلک۔ کوئی کسی حیلے سے پُہنچا دے مجھے

مُنہ نہ دِکھلاوے نہ دِکھلا۔ پر بہ اندازِ عتاب
کھولکر پردہ۔ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہی۔ کہ میں
زلف گر بن جاؤں۔ تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

بازیچۂ اطفال ہی دنیا مرے آگے
ہوتا ہی شب و روز تماشا مرے آگے

اِک کھیل ہی اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہی اعجازِ مسیحا مرے آگے

جُز نام۔ نہیں صورتِ عالم۔ مجھے منظور

جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
ہوتا ہی نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہی جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہی میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہی تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہی بُتِ آئینہ سیما مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گذرے ہی میں رشک سے گذرا
کیونکر کہوں "لو نام نہ اُن کا مرے آگے"

ایماں مجھے روکے ہی۔ جو کھینچے ہی مجھے کُفر
کعبہ مرے پیچھے ہی۔ کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں۔ پہ معشوق فریبی ہی مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہی۔ لیلےٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں۔ پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے

ہی مَوجزن اک قلزمِ خوں۔ کاش یہی ہو
آتا ہی ابھی دیکھیئے۔ کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جُنبش نہیں۔ آنکھوں میں تو دَم ہی
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہی میرا

غالب کو برا کیوں کہو - اچھا - مرے آگے

کہوں جو حال - تو کہتے ہو "مدّعا کہیے"
تمھیں کہو - کہ جو تم یوں کہو - تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم - کہ "ہم ستمگر ہیں"
مجھے تو خو ہی - کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے

وہ نیشتر سہی - پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت - جراحتِ پیکاں
وہ - زخمِ تیغ ہی - جسکو کہ دلکشا کہیے

جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے - اُس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان۔ تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان۔ تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو الفت نہو۔ نگار تو ہے
روانیِ روشِ و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا۔ غالب

خدا سے۔ کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرف بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب۔ سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہی کون۔ نالۂ بلبل کو نے اثر؟
پردے میں گل کے۔ لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہی کیا۔ وجود و عدم۔ اہلِ شوق کا؟
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گِلہ
کی ایک ہی نگاہ - کہ بس خاک ہو گئے
اِس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جسکو دیکھ کے غمناک ہو گئے

نشّہ ہا - شاداب رنگ - و - ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مَی - سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ - ہی
ہمنشیں مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست"
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ - ہی

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں - برائے خندہ ہی
دعوئِ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہی
ہی عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل

یک جہاں زانو تامّل - در قفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو - عیشِ بیتابی حرام

ورنہ - دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر - ورنہ یاں

دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے

آئنہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

تاکجا اے آگہی - رنگِ تماشا باختن ؟

چشمِ واگردیدہ - آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی

مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

عالم۔ غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی

افسردگی نہیں۔ طرب انشائے التفات
ہاں درد بن کے۔ دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم۔ ملامت نہ کر مجھے
آخر۔ کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز

تُو وہ نہیں۔ کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت ہی صدفِ گوہرِ شکست

نقصاں نہیں۔ جنوں سے جو سودا کرے کوئی

سر پر ہوائے وعدۂ صبر آزما سے عمر

فرصت کہاں۔ کہ تیری تمنّا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز

یہ درد وہ نہیں۔ کہ نہ پیدا کرے کوئی

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل

جب ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ تو پھر کیا کرے کوئی

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ

پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال۔ جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں۔ اور سُنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے۔ خدا کرے۔ کوئی

نہ سُنو۔ گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو۔ گر بُرا کرے کوئی

روک لو۔ گر غلط چلے کوئی
بخش دو۔ گر خطا کرے کوئی

کون ہے۔ جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقّع ہی اُٹھ گئی۔ غالب
کیوں کسی کا گِلہ کرے کوئی

بہت سہی - غمِ گیتی - شراب کم کیا ہی
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہی

تمھاری طرزِ روش - جانتے ہیں ہم - کیا ہی
رقیب پر ہی اگر لطف - تو ستم کیا ہی

سخن میں - خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہی ہمکو بھی لیکن اب اُس میں دم کیا ہی

باغ پاکر خفقانی - یہ ڈراتا ہی مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہی مجھے

جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر - معلوم
ہوں میں وہ سبزہ - کہ زہراب اُگاتا ہی مجھے

مدّعا - محوِ تماشائے شکستِ دل ہی
آئنہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہی مجھے

نالہ - سرمایۂ یک عالم - و - عالم - کفِ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہی مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں - اب گئے پر کون اُٹھاتا ہی مجھے

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی	اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگزار کی
جب اُسکے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ	لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
جوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے	کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان۔ لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل۔ کیا رہے گا اُسکی گردن پر
وہ خوں۔ جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں۔ لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھلجائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط - تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح - اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ - جو - جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبّت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں - کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

کوہ کے ہوں بارِ خاطر - گر صدا ہو جائیے

بے تکلّف اے شرارِ جستہ۔ کیا ہو جایئے
بیضہ آسا۔ تنگ بال و پر پہ ہی۔ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو۔ گر رہا ہو جایئے

مستی بذوقِ غفلتِ ساقی۔ ہلاک ہی
موجِ شراب یک مژہ خوابِ تاک ہی

جز زخمِ تیغِ ناز۔ نہیں دل میں آرزو
خالی خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہی

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں۔ اسد
صحرا ہماری آنکھ میں یکمشتِ خاک ہی

لبِ عیسیٰ کی جنبش۔ کرتی ہی گہوارہ جنبانی
قیامت۔ کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہی

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے اُنگلی۔ جادہ سے

بزمِ مے۔ وحشت کدہ ہے کسی چشمِ مست کا
شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اس سے۔ کہ مطلب ہی برآوے

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

ہجومِ نالہ۔ حیرت عاجزِ عرضِ ایک افغاں ہے
خموشی۔ ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

تکلف برطرف۔ ہے جانستاں ترا لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز۔ تیغِ تیزِ عُریاں ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیت شادی
کہ صبحِ عید مجھکو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ سرصر کا مرجاں ہے

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ

کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہی

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہی
نافہ۔ دماغِ آہوے دشتِ تتار ہی

کس کا سراغِ جلوہ ہی حیرت کو۔ اے خدا
آئینہ۔ فرشِ شش جہتِ انتظار ہی

ہی ذرّہ ذرّہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
گردام یہ ہی۔ وسعتِ صحرا شکار ہی

دلِ مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدّمہ پھر رُو بکار ہی

چھڑکے ہی شبنم۔ آئینۂ برگِ گل پر آب
اے عندلیب۔ وقتِ وداعِ بہار ہی

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے۔ پہ یاں انتظار ہے

نے پردہ۔ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرّے کے نقاب میں دل بے قرار ہے

اے عندلیب۔ یک کفِ خس۔ بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا۔ خبر نہ سہی۔ سیر ہی سہی
اے بے دماغ۔ آئنہ تمثال دار ہے

غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں۔ تجھے کیا انتظار ہے؟

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ۔ سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں۔ اے خدا
افسونِ انتظار۔ تمنّا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے۔ ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک۔ کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ۔ دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار۔ پنبۂ مینا کہیں جسے

غالب - بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

شبنم - بہ گلِ لالہ - نہ خالی - ز - اَدا ہے
داغِ دلِ بیدرد - نظر گاہِ حیا ہے
دل - خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بُتِ بدمستِ حنا ہے
شعلے سے نہ ہوتی - ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی - کہ بصد ذوق
آئینہ بہ اندازِ گل - آغوش کشا ہے
قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ

اے نالہ۔ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہی

خُو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دِل کو

معشوقی و بے حوصلگی۔ طُرفہ بلا ہی

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت

دستِ تہِ سنگ آمدہ۔ پیمانِ وفا ہی

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ

تیغِ ستم۔ آئینۂ تصویر نما ہی

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب۔ اِدھر بھی

سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہی

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یارب۔ اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہی

بے گانگیِ خلق سے۔ بے دل نہو غالب
کوئی نہیں تیرا۔ تو۔ مری جان۔ خدا ہی

منظور تھی یہ شکل۔ تجلّی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے۔ ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروروں بناؤ ہیں
پڑتی ہی آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ۔ نہ تم پیو۔ نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہی۔ تمھاری شراب طہور کی

لڑتا ہی مجھ سے حشر میں قاتل۔ کہ کیوں اُٹھا
گویا۔ ابھی سُنی نہیں آواز صُور کی

آمد بہار کی ہی جو بلبل ہی نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہی۔ زبانی طیور کی

گو۔ واں نہیں۔ پہ واں کے نکالے ہوے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی

کیا فرض ہی۔ کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ۔ نہ ہم بھی س

گرمی سہی کلام میں۔ لیکن نہ ا

غا

حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج - کہ کم ہے مئے گلفام - بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے - ورنہ
ہے یوں - کہ مجھے دُردِ تہ جام - بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے - نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کہ - نہو گرچہ ریائی
اداش عمل کی - طمعِ خام - بہت ہے
م - بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو۔ مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے۔ جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات۔ کہ اُن کو
اِنکار نہیں۔ اور مجھے ابرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں۔ کہ ابھی کام بہت ہے
ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لختِ لخت کو

عرصہ ہوا ہی دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہی دَم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
پھر گرمِ نالہائے شرر بار ہی نفس
مدّت ہوئی ہی سیرِ چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہی عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہی خامۂ مژگاں۔ بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے
باہم گرہ ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظّارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دِل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو

سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے
غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیّۂ طوفاں کیے ہوئے

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے
رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

وہ زندہ ہم ہیں۔ کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم۔ کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

فلک نہ دور رکھ اُس سے مجھے۔ کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے

مثال یہ مری کوشش کی ہے۔ کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے
جو شامت آئی

اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

دیا ہی خلق کو بھی۔ تا اُسے نظر نہ لگے

بنا ہی عیش تجمل حسین خاں کے لیے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

نصیرِ دولت و دیں۔ اور معینِ ملّت و ملک

بنا ہی چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے

زمانہ عہد میں اُس کے ہی محوِ آرائش

بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

د - طوطیِ بسمل باندھا

ے عربدہ میداں مانگا

عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

شنگیِ ذوق کے مضموں - غالب

گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

ِ مِ مے سے - یوں تشنہ کام آؤں

گر میں نے کی تھی توبہ - ساقی کو کیا ہوا تھا؟

ِیس میں - دونوں چھلنے پڑے ہیں

در ..

گھر ہمارا - جو نہ روتے بھی تو - ویراں ہو.

تنگیِ دل کا گلہ کیا - یہ وہ کافر دل ہے	کہ اگر تنگ نہ
بعدِ یک عمرِ ورع - بار تو دیتا - بارے	کاش - رضواں ہی - در

نہ تھا کچھ - تو خدا تھا - کچھ نہ ہوتا - تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو - ہونے - نے - نہ ہوتا میں تو

ہوا جب غم سے یوں بےحس - تو غم کیا - سر کے کٹنے کا

نہ ہوتا گر جدا تن سے - تو زانو پر د

ہوئی مدت - کہ غالب مر گیا - پر یاد آتا ہے

ورق تمام ہوا۔ اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے۔ اِس بحر کے کراں کے لیے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

(غزلیات تمام ہوئیں)

قصائد

سازِ یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بیداغ سویدائے بہار

مستیِ بادِ صبا سے ہی بعرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

سبزہ ہی جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہی ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

مستیِ باد سے گلچینِ طرب ہی حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہی دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سونپے ہی فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سر نوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال
قوّتِ نامیہ اُسکو بھی نہ چھوڑے بیکار

کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

میکدے میں ہو اگر آرزوئے گلچینی
بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوتکدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف۔ جوہرِ سیرِ عرفا
چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہی اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں۔ پرِ بلبل گلزار

شکلِ طاؤس کرے آئنہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے۔ بہ ہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہی بروے گردوں
سلکِ اختر میں مہ نو مژۂ گوہر بار

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ لعنتِ بنی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

جوہرِ دستِ دعا آئنہ یعنی تاثیر
یک طرفِ نازشِ مژگانِ دگر سو غمِ خار

مردمک سے ہو غزا خانۂ اقبالِ نگاہ
خاکِ درگہ کی تری جو چشم نہ ہو آئنہ دار

دشمنِ آلِ نبی کو۔ بہ طرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو۔ طاقِ دیوار

دیدۂ تا دل۔ اسد آئینۂ یک پرتوِ شوق

فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ اقسم شرار

قصیدہ

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہی نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہی نہ دیں

ہرزہ ہی نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہی آئنۂ فرقِ جنوں و تمکیں

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دردِ یک ساغرِ غفلت ہی بہ دنیا و بہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکیں

عشق بیربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگارِ رخِ آئنۂ حسنِ یقیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بیستوں آئنۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہاے حزیں

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں۔ لیکن
نہ سر و برگِ ستایش۔ نہ دماغِ نفریں

کسقدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم۔ خارجِ آداب و وقار و تمکیں

نقشِ لاحول لکھ۔ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علیؑ عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں

ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہی واں گردۂ تصویرِ زمیں

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہی ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اُس کی ہی یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

فیضِ خلق اُس کا ہی شامل ہی کہ ہوتا ہی سدا
بوے گل سے نفسِ بادِ صبا۔ عطر آگیں

برشِ تیغ کا اُسکی ہی جہاں میں چرچا
قطع ہو جاے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہی کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں

جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا
وصی ختم رسل تو ہے بفتوائے یقیں

جسم اطہر کو ترے دوش پیمبر منبر
نام نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہر آئینۂ سنگ
رقم بندگی حضرت جبریل امیں

تیرے در کے لیے اسباب نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں

جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شوخی عرض مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسن قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

غم شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو الفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق — کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا — نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرفِ اعدا۔ اثرِ شعلہ و دودِ دوزخ — وقفِ احباب۔ گل و سنبلِ فردوسِ بریں

قصیدہ

ہاں۔ مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام — جسکو تو جھک کے کر رہا ہی سلام
دو دن آیا ہی تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہی گردشِ ایّام
اُڑ کے جاتا کہاں۔ کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص — حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہی عید کا پیغام

اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا - کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور تیرا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھکو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں
ایک ہی ہے امیدگاہِ انام

میں نے مانا - کہ تُو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غلام ؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تُو
تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو - اے ماہ
قُربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھکو کیا پایہ روشناسی کا
جُز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تُو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن - ماہتاب بن - میں کون
مجھکو کیا بانٹ دیگا تو انعام

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص | گر تجھے ہے امید رحمت عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرّ فروغ | کیا نہ دیگا مجھے مئے گلفام؟
جبکہ چودہ منازل فلکی | کرچکی قطع تیری تیزی گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر | کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز | اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا | توسن طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہر غم کر چکا تھا میرا کام | تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں | غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا - یہی غنیمت ہے | کہ نہ سمجھیں وہ لذت دشنام

کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردش دام

بوسہ دینے میں اُن کو ہے اِنکار
دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصّہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ۔ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام ؟

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال والاکرام

شہسوارِ طریقۂ اِنصاف
نَو بہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیِ اِلہام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اُستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرّخی فرجام

چشم بد دور خسروانہ شکوہ
حوش اللہ عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جُرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تُور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیژن و رہّام

مرحبا موشگافیِ ناوک
ق
آفریں آبداریِ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

ق

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
ترے رخشِ سبک عناں کا خرام

فنِ صورت گری میں تیرا گزر	ق	اگر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام

ق

اُس کے مضروب کے سرِ تن سے		کیوں نمایاں ہو صورتِ اِدغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے	ق	صفحہ ہائے لیالی و ایّام
اور اُن اَوراق میں بہ کلکِ قضا		مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھدیا شاہدوں کو عاشق کُش		لکھدیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں		گُنبدِ تیز گرد نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں		خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی		وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز		ماہِ تاباں کا نام شحنۂ شام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی		دی بدستورِ صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجب حکم
اُس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روانیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

قصیدہ

صبحدم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اِک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ۔ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رُخ۔ سر کھلا

تھی نظر بندی۔ کیا جب ردِّ سحر
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لاکے ساقی نے صبوحی کے لیے
رکھدیا ہی ایک جامِ زر کھُلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا

تاجِ زرّیں۔ مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھُلا

شاہِ روشن دِل بہادر شہ۔ کہ ہی
رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھُلا

وہ۔ کہ جسکی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھُلا

وہ۔ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھُلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہی نام
اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھُلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہی
واں لکھا ہی چہرۂ قیصر کھُلا

قطعہ

توسنِ شہ میں ہی وہ خوبی کہ جب
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھُلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب
تو کہے بُتخانۂ آزر کھُلا

مجھپہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہ و محور کھُلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک
میری حدِّ وسع سے باہر کھُلا

تھا دلِ وابستہ قفل نے کلید
کس نے کھولا۔ کب کھُلا۔ کیونکر کھُلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھُلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھُلا

غزل

کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھُلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھُلا

ہم پکاریں۔ اور کھُلے۔ یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھُلا

ہمکو ہی اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہی راز دشمن پر کھُلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم۔ لیکن داغ سے بہتر کھُلا

ہاتھ سے رکھدی کب ابروُ نے کماں
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھُلا

مفت کا کس کو برُا ہی بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھُلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی۔ مینہ اگر دم بھر کھُلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا

دیکھیو۔ غالب سے گر اُلجھا کوئی
ہی ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھُلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کھُلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
عرض سے۔ یاں رتبۂ جوہر کھُلا

مہر کانپا۔ چرخ چکّر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھُلا

بادشہ کا نام لیتا ہی خطیب
اب عُلوّ پایۂ منبر کھُلا

سکّۂ شہ کا ہوا ہی روشناس
اب عیارِ آبروے زر کھُلا

شاہ کے آگے دھرا ہی آئینہ
اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

ہو سکے کیا مدح۔ ہاں اِک نام ہی
دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

فکر اچھی۔ پر ستایش ناتمام
عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا

جانتا ہوں ہی خطِ لوحِ ازل
تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہی طلسمِ روز و شب کا در کھلا

در صفتِ انبہ

ہاں دلِ دردمندِ زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخِ گل کا ہی گلفشاں ہونا

مجھ سے کیا پوچھتا ہی کیا لکھیے
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رُطب فشاں ہو جائے

آم کا کون مردِ میداں ہے
ثمر و شاخ گوے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں
آئے یہ گوے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جائے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور
باؤہ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمھیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گل اُس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
جب خزاں آئے تب ہو اُسکی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن - باوجودِ غمگینی

جان دینے میں اُس کو یکتا جان
پر - وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہی یوں مجھے یہ ثمر
کہ دوا خانۂ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہی قوام
شیرہ کے تار کا ہی ریشہ نام

یا - یہ ہو گا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنّت سے

انگبیں کے - بہ حکم ربّ الناس
بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مُہر گلاس

یا - لگا کر خضر نے شاخِ نبات
مدّتوں تک دیا ہی آبِ حیات

تب ہوا ہی ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

تھا ثمر بخ زر - ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد - پر کہاں بو باس

آم کو دیکھتا اگر اک بار
پھینک دیتا طلاے دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دود و مانِ آب و ہوا

رہروِ راہِ خلد - کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہی آم
ناز پروردۂ بہار ہی آم

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ - کہ ہی والیِ ولایتِ عہد
عدل سے اُس کے ہی حمایتِ عہد

فخرِ دیں عزّ و شان و جاہ و جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا ہُما کا سایہ ہی
خَلق پر وہ خدا کا سایہ ہی

اے مَفیضِ وجودِ سایۂ و نور
جب تلک ہی نمودِ سایۂ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شاد ماں رکھیو
اور غالب پہ مہرباں رکھیو

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بسخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بکرم داغِ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توقیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

بختِ نا سازنے چاہا کہ ندے مجھکو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھکو ذلیل

پیچھے ڈالی ہی سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہی بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

پیشِ دل نہیں بے ربطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحۂ لقا کی داڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینۂ عمر کی زنبیل

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ایہام پہ ہوتی ہی تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہی تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

قطعہ

گئے وہ دن کہ ناداستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

بس اب بگڑنے پہ کیا شرمندگی۔ جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں۔ کیوں ہم نہ کہتے تھے

قطعہ

کلکتہ کا جو ذکر کیا۔ تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ اُنکا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازۂ و شیریں۔ کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

در تعریف ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہیے

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں۔ کہ اسے کیا کہیے

مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے — حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے

مسی آلود سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے — داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے — سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے — خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلا کہیے

حجرِ الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض — نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اسکو اگر سمجھیے قافِ تریاق — رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز — میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبّت لکھیے — کیوں اُسے نقطۂ پرکارِ تمنّا کہیے

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجے — کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے — کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہیے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض — اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

قطعہ

نہ پوچھ اسکی حقیقت حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہی بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

سہرا

خوش ہو لے بخت کہ ہی آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پہ سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہی
ہی ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہی پہ اے طرفِ کلاہ
مجھکو ڈر ہی کہ نہ چھینے ترا نمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہی رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کی برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مکرّر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخِ روشن کی دمک۔ گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں ہی یہ رگِ ابرِ بہار
لائیگا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا؟

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکر سہرا

(نوٹ) شہزادہ مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر مرزا صاحب نے یہ سہرہ کہکر بادشاہ ابوظفر کے حضور میں گزرانا تھا مقطع کو سنکر بادشاہ کو خیال ہوا کہ یہ اُن کے اُستاد پر تعریض ہی۔ چنانچہ اُستاد ذوق نے بھی اس سہرے کا جواب اسی ردیف وقافیہ میں لکھا اس پر مرزا نے مندرجہ ذیل قطعہ لکھکر بادشاہ کی حضور میں پیش کیا تھا۔

منظور ہی گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سے مدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زِ رہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو۔ تو روسیاہ — سودا نہیں۔ جنوں نہیں۔ وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی۔ پہ طبیعت بری نہیں — ہے شکر کی جگہ۔ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سر دست
نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں
یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

متفرقات

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئ مشکبو کی ناند

جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند

غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ پادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

در مدح شاہ

اے جہانگیر جہاں بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اُس عقدہ کو سو بھی باشارت

ممکن ہی کہ کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟ | گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا | ہی فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت
ہی نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی | ہی داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

قطعہ

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں | تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈھے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی | باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
ہی گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل | ہی گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر | قاصر ہی شکایت میں تری میری عبارت
نوروز ہی آج اور وہ دن ہی کہ ہوے ہیں | نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھکو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک

غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دست گاہ ہو
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

گزارش مصنّف بحضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے۔ نوکر بھی ہو گیا صد شکر
نسبتیں ہو گئیں مشخّص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں ؟
مدّعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں۔ ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کی سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی سال

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعر نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستان اگر سنیے — ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میری ابر گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ — تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ

سپہ گلیم ہوں لازم ہی میرا نام نہ لے — جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہی
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے — کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہی

قطعہ

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی — مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے

تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

قطعۂ تاریخ

خجستہ انجمن طوے میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی (بیاہ) فرخندہ سال میں غالب
نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی محظوظ
۱۸۵۴ء

دیگر

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالب سے تاریخ اسکی کیا ہے
تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"
۷۰ ھ ۱۲

قطعہ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کہتے ہوئے سلام

دربار دار لوگ ہم آشنا نہیں
اس سے ہی یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعیات

بعد از اتمام بزمِ عیدِ اطفال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم

ایامِ جوانی رہے ساغرکشِ حال
اے عمرِ گزشتہ۔ یک قدم استقبال

دیگر

شب۔ زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک

کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
ہر قطرۂ اشک۔ دیدۂ پُر نم تھا

دیگر

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال

تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی	لڑکوں کے لیے گیا ہی کیا کھیل نکال
دِل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی ہم اور فسونِ۔ اے تجلّی افسوس	بیتابیِ رشک و حسرتِ دید سہی تکرار روا نہیں۔ تو تجدید سہی
ہی خلق حسد قماش۔ لڑنے کے لیے یعنی ہر بار صورتِ کاغذ باد	وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے
دل سخت نژند ہو گیا ہی گویا پیارے کے آگے بول سکتے ہی نہیں	اُس سے گلہ مند ہو گیا ہی گویا غالبؔ منہ بند ہو گیا ہی گویا

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہی غالب
دل رک رک کر بند ہو گیا ہی غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہی گویا

مشکل ہی زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

بھیجی ہی جو مجھکو شاہِ جمجاہ نے دال
ہی لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہی دولت و دین و دانش و داد کی دال

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہی ابکی شبِ قدر و دوالی باہم

دیگر

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہی رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہی صفر کہ افزایشِ اعداد کرے

دیگر

اِس رشتہ میں لاکھ تار ہوں۔ بلکہ سوا
اِتنی ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

دیگر

کہتے ہیں۔ کہ اب وہ مردمِ آزار نہیں
عشّاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہو گا
کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

دیگر

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں۔ کہیں خدا سے۔ اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے۔ غالبؔ۔ لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

دیگر

اِن سیم کے بچوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں۔ جوار مغاں۔ شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

چند اشعار جو دیوان مروّجہ میں نہیں ہیں

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی
تم ہو بُت۔ پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ۔ خدا اور سہی

نوٹ :- وہ جدید کلام جسکو لوگ غالبؔ کے نام سے منسوب کرتے ہیں لیکن وہ غالبؔ کے طرز سے علاحدہ ہے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

خُلد میں کہیے تو دوزخ بھی ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ہم سے غالبؔ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

شب۔ کہ ذوقِ گفتگو سے تیری۔ دل بیتاب تھا
شوخیِ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

دل ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

دُود کو آج اُس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

ہندوستاں سایۂ گل۔ پائے تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں۔ نہ پوچھ

ہر داغِ تازہ۔ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ دردامتحاں۔ نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ محرمِ رازِ اپنے سے کہ آہ
دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ

غالبؔ۔ زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

کمالِ حُسن۔ اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو
تکلف برطرف۔ تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

تمام شد

صحت نامہ دیوان ہذا

انسان نسیان کا پُتلا ہی، اُس کا یہ دعویٰ کہ میرے کام میں غلطی نہیں، خطا ہی۔ نسیان اگرچہ ایک ظلمت ہی، مگر انسان کے لیے آئینۂ حق نما ہی۔ ہمیشہ اُس کے پُرغرور ارادوں کو اسی نے توڑا اور اس شکست کی آواز میں یہ کہتے سُنا:۔

عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمْ

من حیث الانسان ہم نے بھی اس دیوان کی تصحیح کے متعلق بہت دعوے اور ارادے کیے تھے مگر بالآخر ناگہانی علالت سے یا بغیر کسی عذر لنگ کے یہ کہکر بات بنانی پڑی:۔

مجھے یہ ڈر ہی کہ ایمان لے نہ آئیں لوگ
خدا کرے غلطی کچھ مرے سخن میں رہے

یعنی باایں ہمہ اہتمام تصحیح اکثر املائی اور کتر انشائی غلطیاں اس دیوان میں رہ گئیں ہیں۔ لہذا ناظرین کرام سے امید ہی کہ مندرجہ ذیل اغلاط کے سوا اگر دیگر محاسن و مناظر قابل تحسین ہوں تو اُن خوبیوں کے پردے میں ان عیبوں کو نظر انداز فرمائیں۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ۔

معترف ناکامی
خاکسار نظامی
۲۲ مارچ ۱۹۱۵ء

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵	۴	اے	ہے
〃	۶	دریا	طوفان
〃	۱۰	مشکیں	سرکش
۷	۱۱	نے	میں
۸	۸	دماں	درباں
۹	۵	آلو	آلودہ
۱۳	۸	سپندِ بزم۔ وصلِ غیر کو	سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو،
۱۷	۲	ایک	اک
۱۸	۳	بلا	وفا
〃	۸	جاناں۔	جانا۔
۱۹	۱۱	حسن	خس
۲۱	۴	آئینہ	آئنہ
〃	۹	جو دکھ	وہ دُکھ
〃	۱۰	جو فتنہ	وہ فتنہ
۲۳	۵	نکہت	نکہتِ
۲۴	۱	اب	آب
۲۶	۵	عشق	عشّق
۲۷	۲	دل نے ہر اک ذرّہ	شوق نے ہر ذرّے پر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۹	۱	ایک	اک
〃	۱۰	پہ	بہ
۳۳	۶	ریختی	ریختے
۳۴	۹	ایک	اک
۳۶	۸	رنگ	رشکِ
۳۷	۵	ہم اور	اور ہم
〃	۹	دردِ دکھوں	دردِ دل لکھوں
۳۸	۶	تذر	نظر
۳۹	۵	نفسِ	نگہِ
۴۴	۲	کے تھے	کی تھی
〃	۵	حرف پہ	حرف پر
۴۶	۱	پرسش۔ مجھ سے	میری پرسش
۵۶	۷	رُک	چڑھ
۵۷	۷	آئنہ	آئینہ
۵۸	۲	گلخن	گلخنِ
〃	۴	تو مشقِ	کہ مشقِ
۵۹	۸	داد دستد	داد دستد
۶۰	۷	نازِ مفلساں۔ نہ	نازِ مفلساں نہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۱	۱	آئینۂ	آئنۂ	۱۱۰	۷	عین	اصل
۶۳	۱۰	ہوجیے خوباں دل	ہوجیسے خوبانِ دل	۱۱۳	۳	کو	تو
۶۵	۵	پُرفشانی	پَرفشانی	۱۱۴	۷	ناسپاس	[illegible]
۶۷	۶	ہستی فرصت	فرصتِ ہستی	۱۱۹	۱۱	ہمزباں	ہمرنگ
〃	〃	ایک رقص	یک رقص	۱۲۰	۹	سیکھیں	سیکھے
۷۲	۷	عم	غش	۱۳۰	۶	بھری	بنی
۷۸	۶	گر	گھر	〃	۱۰	سووہ	وہ
۷۹	۱۰	برشگال	برشکال	۲۰۸	۸	عرضِ ایک	عرضِ یک
۱۰۰	۴	مرے	مرا	۲۲۱	۱	خوشامدسے	[illegible]
〃	۱۰	پڑ	پر	۲۲۴	۴	سبزہ	[illegible]
۱۰۳	۱	اسے	اُسے	۲۵۵	۱۰	اب کے سال	اب کے بار
۱۰۵	۹	آیئنہ	آئنہ	۲۶۲	۴	اتنی ہی	اتنے ہی

کسوف الشمسین

یعنی

شمس العلما مولانا شبلی اور شمس العلما خواجہ حالی

کا

مرثیہ

مصنفہ حضرت احسن مارہروی مدظلہٗ

جس کے ساتھ ان دونوں آفتاب و ماہتاب علم و ادب کے مختصر حالات نثر میں لکھے گئے ہیں

قیمت فی جلد ۴ر

منیجر نظامی پریس بدایوں سے طلب کیجیے